تعلیم و تربیت

اس شمارے میں

- قبر کا بھوت، دل چسپ اور ناقابلِ یقین
- مجاہدینِ آزادی، چھٹی ہاکی ٹسٹ سیریز
- منٹو کی واپسی، کنگوتری کا شہزادہ

مئی 1998ء

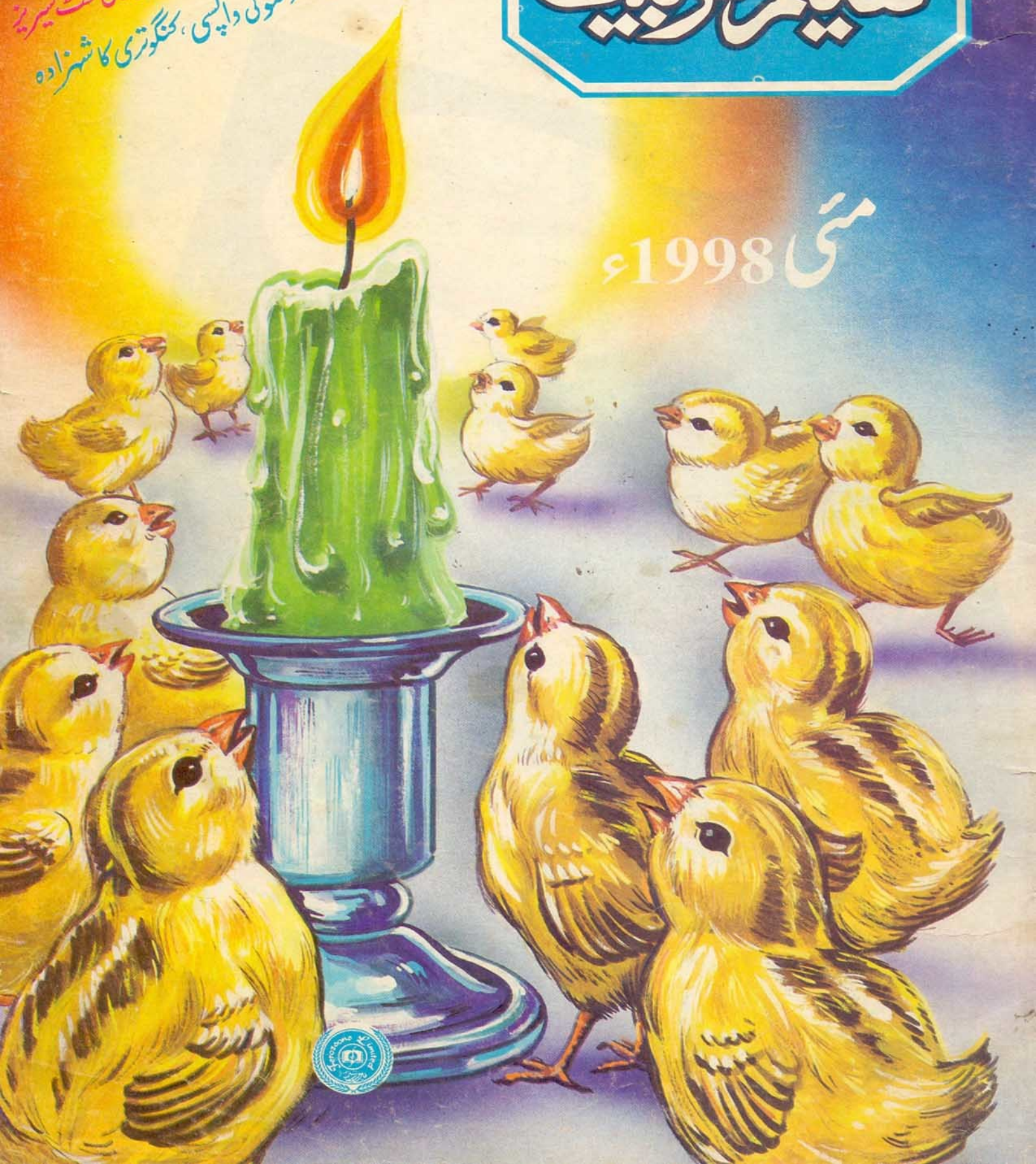

دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں اور نظمیں سب آپ کے لیے

یہ کتابیں خود بھی پڑھیے
اپنے عزیزوں اور قریبی دوستوں کو
تحفے کے طور پر بھی دیجیے۔

مزید کتابیں
دیکھنے کے لیے ہمارے
شوروم میں
تشریف لائیں

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف اڈیٹر	اڈیٹر/پبلشر	مشیر	سینئر اسسٹنٹ اڈیٹر	خصوصی مشیر	اسٹریشنز/ڈیزائننگ	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	سعید لخت	ڈاکٹر رضوان ثاقب	محمود حسن روی	سید شوکت اعجاز	محمد بشیر راہی

خوش خبری

★ "دھوپ چھاؤں"

★ ایک دل چسپ سلسلہ وار ناول جس میں

★ قسطانی کا پراسرار اغوا

★ کلو کے ایکشن اور ذہانت پر مبنی شان دار کارنامے

★ پر لطف اور پر مزاح مکالمے

بچوں کے نامور ادیب کے قلم سے، آئندہ ماہ پہلی قسط ملاحظہ فرمائیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

ہمارے تقریباً تمام ساتھیوں نے تعلیم و تربیت کے ماں نمبر کو بے حد پسند کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ یہ واقعی ہماری توقعات سے بڑھ کر ہے۔ سینکڑوں ساتھیوں نے تو ہمیں یہ بھی لکھا ہے کہ تعلیم و تربیت کا ماں نمبر نہ صرف ایک یادگار شمارہ ہے بلکہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے۔ اس بات پر ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہماری محنت رنگ لائی اور ماں نمبر آپ کو پسند آیا۔

بہت سارے ساتھیوں نے ہمیں اپنے پاس ہونے کی خوش خبری سنائی ہے۔ عزیز ساتھیو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور یہ بات اچھی طرح پلے باندھ لو کہ تعلیم کے میدان میں کی گئی محنت تو انسان کو نام ور اور عظیم بنا دیتی ہے۔ ہماری طرف سے پاس ہونے والے سب ساتھیوں کو دلی مبارک باد۔ اللہ کرے کہ آپ اسی طرح خوب محنت کرتے رہیں اور کام یابیاں آپ کے قدم چومتی رہیں۔

اور اب آپ کے لیے ایک خوش خبری، جون 1998ء سے ہم آپ کے لیے سراغ رسانی اور مہم جوئی کے کارناموں سے بھرپور ایک نیا دل چسپ اور سبق آموز ناول شروع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو یہ بہت پسند آئے گا۔ اپنے دوستوں کو بھی ابھی سے بتا دیں کے جون 98ء یعنی اگلے مہینے کا تعلیم و تربیت خریدنا نہ بھولیں۔ ورنہ وہ اس دل چسپ ناول سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ اڈیٹر

Variety Book Stall
New Market Secondroad
Lahore Ph. 7588307

سرورق: موم بتی اور چوزے

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

مئی 1998ء

قیمت فی پرچہ =/15 روپے

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

اداریہ		1
آل محمدؐ (درس حدیث)	سید مقبول حسین	2
انوکھا قیدی (سچی کہانی)	نعیم احمد بلوچ	3
اپنی چیزیں رکھو صاف (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	6
قبر کا بھوت (کہانی)	محمد یونس حسرت	7
سب سے پہلا بادشاہ (کہانی)	سید نظر زیدی	13
چوزے اور موم بتی (کہانی)	نجمہ معراج	17
نیا روپ (سائنس فکشن)	حسن ذکی کاظمی	21
ناقابل یقین	عبدالستار خان طاہر	26
آیئے دوست بنائیں ایک مثالی مولانا	ڈاکٹر رضوان ثاقب	30 31
چھٹی ہاکی ٹسٹ سیریز	ابن الطاف	34
شرارتی لکیریں		36
آیئے مسکرائیں (لطائف)		37
ملا گئے شکار کو	شاہد ریاض شاہد	38
منو کی واپسی (کہانی)	بخت رسا	42
ہونہار مصور		52
مچھر (نظم)	شیخم حمیدی	53
آپ بھی لکھئے		54
کنگو ترے کا شہزادہ (کہانی)	سلیم خان گی	60
بلا عنوان کارٹون		68
باقی سب دل چسپ سلسلے حسب معمول		

سالانہ قیمت

پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32، شارع بن بادیس، لاہ

آلِ محمد ﷺ

سید مقبول حسین

حدیث شریف میں ہے "حسین ؓ میرا ہے اور میں حسین ؓ کا ہوں" اور ایک دوسری حدیث میں رسول کریم ﷺ نے اپنی بیٹی کے بارے میں فرمایا: "فاطمہ ؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جو شے فاطمہ ؓ کو رنج پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی رنج دیتی ہے"۔

سب مسلمانوں کو اپنے پیارے رسول حضرت محمد ؐ اور آپ ؐ کی آل یعنی آپ ؐ کے کنبے سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ایمان والوں کو نبی ؐ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہے اور آپ ؐ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"۔

حضرت امام حسین ؓ حضرت علی المرتضیٰ ؓ کے فرزند تھے۔ آپ ؓ کی والدہ حضرت فاطمتہ الزہرا ؓ تھیں جو سرور کائنات حضرت محمد ؐ کی صاحب زادی تھیں۔ اس طرح امام حسین ؓ نواسہ رسول ؐ تھے۔ حضرت حسن ؓ آپ ؓ کے بڑے بھائی تھے۔ رسول کریم ؐ سجدے میں جاتے تو امام حسن ؓ اور امام حسین ؓ پشت مبارک پر بیٹھ جاتے اور آپ ؐ سجدہ لمبا کر دیتے۔ اس طرح امام حسن ؓ اور امام حسین ؓ نے رسول کریم ؐ کی گود میں پرورش پائی۔

رسول کریم ؐ کے بعد حضرت عمر ؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت معاویہ ؓ ملک شام کے حاکم مقرر ہوئے اور بیس سال تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ حضرت علی ؓ کے عہد خلافت کے بعد حضرت معاویہ ؓ خلیفہ بنے۔ ان کی خلافت انیس سال تک قائم رہی۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا یزید تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس نے حضرت امام حسین ؓ سے بیعت لینی چاہی لیکن چوں کہ یزید کا اخلاق و کردار اچھا نہ تھا اور اس طرح وہ مسلمانوں کا خلیفہ بننے کا اہل نہ تھا۔ لہٰذا آپ ؓ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ امام حسین ؓ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں کوفے کے لوگوں نے آپ کو سینکڑوں خطوط لکھے اور آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی اور اپنی حمایت کا پورا یقین دلایا۔ آپ ؓ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو کوفہ بھیجا۔ ہزاروں کوفیوں نے ان کے ہاتھ پر امام حسین ؓ کی بیعت کر لی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے امام حسین ؓ نے کوفے کا سفر اختیار کیا۔ اس دوران میں یزید نے نعمان بن بشیر کو جو کوفہ کا صلح پسند حاکم تھا' معزول کر کے عبداللہ بن زیاد کو کوفے کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس نے امام حسین ؓ کے حامیوں پر اس قدر ظلم کیا کہ تمام لوگ حضرت مسلم بن عقیل ؓ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ پھر حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو شہید کر دیا گیا۔ امام حسین ؓ کو راستے میں یہ افسوس ناک خبر ملی لیکن آپ نے سفر جاری رکھا۔ آپ ؓ کے ہمراہ خاندان کے بہتر افراد تھے۔ عبداللہ بن زیاد نے آپ ؓ کے خلاف ایک لشکر بھیجا اور آپ ؓ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ لیکن آپ ؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ ؓ نے کہا کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ میں خود اس سے بات کروں یا مجھے مدینہ واپس جانے دو۔ عبداللہ بن زیاد نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔

حضرت امام حسین ؓ اور آپ ؓ کے ساتھیوں پر دریائے فرات کا پانی بند کر دیا گیا۔ آخر کربلا کے میدان میں جنگ شروع ہوئی۔ آپ ؓ کے خاندان کے افراد ایک ایک کر کے حق کی راہ پر قربان ہو گئے۔ آپ ؓ دشمن سے بڑی بہادری سے لڑے اور دس محرم الحرام 61ھ کو آپ نے جام شہادت نوش کیا۔

اگر امام عالی مقام چاہتے تو یزید کی بیعت کر کے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچا سکتے تھے لیکن آپ ؓ نے حق و صداقت کی خاطر اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو قربان کر دیا۔ آپ ؓ نے باطل کے سامنے نہ جھک کر رہتی دنیا تک ایک روشن مثال قائم کر دی اور یہ ثابت کر دیا کہ جو لوگ حق و انصاف کی خاطر جان دے دیتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ وہ دوسروں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

سچی کہانی

انوکھا قیدی

نعیم احمد بلوچ

وہ قیدی سپاہیوں کے لیے بڑا قیمتی تھا۔ انہیں وہ باقی تمام قیدیوں میں سب سے زیادہ معزز اور بہادر معلوم ہوا تھا۔ انہوں نے اسے دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کر لیا تھا۔ وہ اس کو بڑی مضبوطی سے زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں یہ دھڑکا ہر لمحے ستا رہا تھا کہ کہیں وہ ان کی گرفت سے نکل کر بھاگ نہ جائے۔ مگر وہ قیدی اس قدر اطمینان اور بے فکری اور وقار کے ساتھ ان کے ساتھ چل رہا تھا کہ دیکھنے والا کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

وہ قیدی ان کے لئے اس لیے قیمتی تھا کہ ان کے بادشاہ نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ مجھے فلاں قوم کا ایسا شخص زندہ حالت میں چاہیے جو ان کے بڑے لوگوں میں سے ہو اور وہ قیدی اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا جس کا مطالبہ بادشاہ نے کیا تھا۔ وہ واقعی اس قوم کے سرداروں میں سے تھا۔ سپاہیوں کو یقین تھا کہ وہ اسے بادشاہ کے حضور پیش کر کے بھاری انعام حاصل کریں گے۔

جب اس قیدی کی خبر بادشاہ تک پہنچی تو اس نے ان سپاہیوں کو خصوصی انعام دیا جنہوں نے اسے گرفتار کیا تھا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ اسے جلد از جلد دربار میں پیش کیا جائے۔

قیدی اگلے ہی دن بیڑیوں میں جکڑا بھرے دربار میں بادشاہ کے سامنے تھا اور اس وقت بھی اس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان اور سکون تھا۔ دربار میں موجود دشمن قوم کے افراد اس قیدی کو خون خوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ درباریوں میں سے اکثر کے چہروں پر نفرت اور تکبر کے تاثرات صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ بادشاہ نے قیدی کو گہری نظروں سے دیکھا پھر اس سے پوچھا کہ وہ کس مذہب اور کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ قیدی نے اپنا مذہب' اپنی قوم اور اپنا نام وہی بتایا جس کی خبر بادشاہ کو دی گئی تھی۔ بادشاہ کو اطمینان ہوا کہ قیدی واقعی اس کا مطلوبہ شکار ہے۔ اس کے بعد وہ قیدی سے مخاطب ہوا۔

"اے قیدی! میرے پاس تمہارے لیے ایک تجویز ہے!"

"وہ کیا؟" قیدی نے خوف سے بے نیاز آواز میں پوچھا۔

"تم اپنا مذہب چھوڑ کر' میرا مذہب اختیار کر لو۔ ایسا کرنے پر میں تمہیں آزاد کر دوں گا اور تم ان درباریوں کی طرح معزز اور مرتبے والے بن جاؤ گے!"

قیدی نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور جواب دیا "ارے بادشاہ! یہ ناممکن ہے۔ میں ہزار دفعہ موت کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہوں لیکن اپنا مذہب چھوڑ کر تمہارے مذہب کو اختیار نہیں کر سکتا!"

"بہت خوب! تم واقعی بہادر ہو اور یہی کچھ میں نے تمہاری قوم کے متعلق سنا تھا لیکن میرا مشورہ تمہیں یہی ہے کہ میرا مذہب مان لو۔ انعام کے طور پر میں تمہیں اپنا خاص وزیر بنا لوں گا!"

دین بدلنے کی یہ رشوت بہت زیادہ تھی لیکن قیدی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بے نیازی سے بولا "خدا کی قسم' تم دین بدلنے کے عوض مجھے اپنی پوری سلطنت کے ساتھ میرے اپنے وطن کی بھی بادشاہت دے دو تو پھر بھی مجھے تمہاری پیش کش قبول نہیں!"

قیدی کے اس جواب پر پہلی مرتبہ بادشاہ کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ وہ بھڑک کر بولا "میں تمہیں قتل کردوں گا!"

جواب ملا "ضرور کرو لیکن یہ توقع مت رکھنا کہ میں اپنا دین بدل لوں گا"۔

"اس کو پھانسی پر چڑھا دو" بادشاہ نے گرج کر حکم دیا۔ ساتھ ہی بادشاہ نے اپنے ایک وزیر کو بلایا اور قیدی کی ہلاکت کے بارے میں کچھ خصوصی ہدایات دیں۔ وزیر نے یہ حکم جلاد تک پہنچادیا۔ اپنی موت کا حکم سن کر قیدی کے چہرے پر خوف یا پریشانی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ بالکل مطمئن دکھائی دیتا تھا۔

فوراً ہی قیدی کو ایک تختے سے باندھ دیا گیا اور جلاد تیر کمان ہاتھ میں الٹا کر اس کا نشانہ لینے لگا۔ اس نے بڑی احتیاط سے نشانہ لیا اور تیر چھوڑ دیا۔

تیر عین نشانے پر لگا۔ ٹھیک وہیں جہاں بادشاہ نے ہدایت کی تھی۔ بادشاہ نے یہ حکم دیا تھا کہ تیر قیدی کے دل میں نہیں بلکہ ہاتھ پر اس طرح سے مارا جائے کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے اور واقعی قیدی کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔

درد کی ٹیسیں اٹھیں اور قیدی کی پیشانی تکلیف کی وجہ سے پسینے سے بھر گئی لیکن اس کے منہ سے اف تک نہ نکلی۔ اس نازک موقع پر بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر اسے اپنا دین بدلنے کا مشورہ دیا مگر قیدی نے پوری شدت سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے جلاد کو دوسرا تیر چلانے کا حکم دیا۔

جلاد نے اس مرتبہ تیر چھوڑا تو وہ قیدی کے دونوں پاؤں کے درمیان لگا۔ اس دفعہ بادشاہ نے محسوس کیا کہ قیدی کے چہرے پر خوف کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔ اس نے چوتھی مرتبہ اسے اپنے دین کو چھوڑنے کا مشورہ دیا مگر قیدی نے پھر انکار کر دیا۔ اب تو بادشاہ کو اپنی بہت بے عزتی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر اس نے عجیب و غریب حکم دیا۔ بلکہ بہت ہی خوف ناک اور وحشت ناک حکم!

"قیدی کو تختے سے اتار لیا جائے اور بڑی دیگ لا کر اس میں تیل گرم کیا جائے!"

قیدی اور درباری سمجھ گئے کہ بادشاہ قیدی کو اس تیل میں ڈال کر زندہ بھون ڈالے گا۔ وہ اس طریقے سے قیدی کو ہلاک کر کے اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

حکم کے مطابق ایک بڑے میدان میں آگ جلائی گئی۔ اس پر دیگ کو رکھ کر اس میں تیل ڈالا گیا۔ جب تیل کھولنے لگا تو بادشاہ کی آنکھوں کی شیطانی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ پھنکارتے ہوئے بولا "ارے قیدی! اب تیرے لیے آخری موقع ہے۔ اب ہی چھوڑ دے اپنے دین کو اور موت کے بجائے زندگی قبول کر لے"۔

قیدی نے نفرت' غصے اور حقارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے آخری مرتبہ بھی انکار کر دیا۔ بادشاہ حلق کے بل چلایا "پھینک دو اس گستاخ کو اس دیگ میں!"

سپاہیوں نے قیدی کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے تیل کی دیگ کے قریب لے آئے۔ اس موقع پر بادشاہ اور اس کے درباریوں نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ قیدی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں!

بادشاہ کو پہلی مرتبہ اپنی ضد کی فتح کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سپاہیوں کو روکا۔ دربار میں اب شور مچ گیا۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے۔ "دیکھو قیدی رو رہا ہے۔ موت اور وہ بھی اس قدر خوف ناک موت! یقیناً وہ موت کی تکلیف کا تصور کر کے رو رہا ہے"۔

بادشاہ نے قیدی کو اپنے قریب لانے کا حکم دیا۔ شاید بادشاہ یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ کیا قیدی واقعی رو رہا ہے؟

قیدی سچ مچ رو رہا تھا۔ اس کے نورانی چہرے پر آنسو موتی بن کر چمک رہے تھے! "اے قیدی' آخر تم نے اپنی ضد چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا.... ٹھیک ہے تم اعلان کرو کہ میرے دین کو قبول کرتے ہو"۔

قیدی نے جواب میں جو کچھ کہا اس سے بادشاہ ہی نہیں دربار کا ہر آدمی چونک پڑا!

"نہیں اے ظالم بادشاہ۔ میں تمہارا مذہب ہرگز قبول نہیں کروں گا!"

تو پھر تم رو کس بات پر رہے ہو؟

"اے احمق بادشاہ! میں موت کے خوف سے نہیں رو رہا۔ میں تو اس حسرت پر رو رہا ہوں کہ کاش میرے پاس ایک سے زیادہ جانیں ہوتیں۔ ایک ہزار جانیں ہوتیں' ایک لاکھ جانیں ہوتیں اور میں ہر جان اس کھولتے ہوئے تیل میں ڈال کر خدا کی راہ میں قربان کر دیتا! مگر افسوس میرے پاس تو ایک ہی جان ہے.... بس اس محرومی پر رو رہا ہوں!"

مجمع پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وقت ٹھہر گیا ہو' ہوا رک گئی ہو۔ منظر ایک تصویر بن گیا ہو' ماضی اور مستقبل ختم ہو کر صرف ایک لمحہ بن گیا ہو!

بادشاہ بھی حیران بت بنا اس عجیب و غریب قیدی کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھلا ایسا انسان زندگی میں کہاں دیکھا ہو گا! لگتا تھا قیدی کی اس بات نے اس کے دماغ پر اثر کر دیا ہے۔ اس نے بھی ایک عجیب بات کہی۔ ایک بہت ہی عجیب بات!

کہنے لگا "اے قیدی! اگر تم میرا سر چوم لو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا!"

قیدی نے بے یقینی سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا "کیا تم میرے ساتھ میرے تمام ساتھیوں کو بھی چھوڑ دو گے؟"

"ہاں! میں تمہارے سارے قیدیوں کو چھوڑ دوں گا!"

قیدی سوچ رہا تھا کہ یہ بادشاہ جتنا ظالم ہے اتنا ہی بزدل ہے۔ ڈر رہا ہو گا کہ جس قوم کا ایک سردار اس قدر بااصول اور بے خوف ہے وہ قوم کس قدر نڈر اور بہادر ہو گی اور اگر میں نے سردار کو یوں بے رحمی سے مروا ڈالا تو یہ لوگ میری سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے اس نے یہ بے تکی شرط رکھ دی ہے۔ یا شاید اس نے میرے دین نہ بدلنے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے اور اب محض بچوں کی سی ضد پر آ گیا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ میرے ہاتھوں اپنی شکست کے بعد میں بھرے دربار میں اس کا سر چوم کر اس کی عزت اور اپنی ذلت کا اظہار کروں۔ لیکن اگر میں نے اس کی یہ بے تکی ضد مان لی تو اس سے میرے دین پر تو کوئی حرف نہیں آئے گا۔ مگر میرے قیمتی ساتھیوں کی جان بچ جائے گی۔ لہٰذا یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ میرے ساتھیوں کی جانیں میری ذات سے بہت زیادہ قیمتی ہیں۔

یہ سوچ کر اس عظیم اور بہادر قیدی نے اپنی ذات پر ساتھیوں کی جان کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا اور آگے بڑھ کر بادشاہ کے سر کو چوم لیا! بادشاہ نے قیدی اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔ وہی قیدی ان کے سامنے بیٹھے تھے جنہوں نے بادشاہ کی کسی دھمکی کا اثر قبول نہیں کیا تھا اور آخر میں اس کا سر چوم کر اپنے ساتھیوں کی جان بچالی تھی۔ اس کی زبانی سارا واقعہ سننے کے بعد بولے "اے عبداللہ بن حذافہؓ تم پر خدا کی ہزار ہا رحمتیں نازل ہوں"۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ اٹھے اور اعلان کیا کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ آگے بڑھ کر عبداللہ بن حذافہؓ کا سر چوم لے اور دیکھو میں سب سے پہلے ان کے سر پر بوسہ دیتا ہوں"۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ اٹھے اور اس انوکھے قیدی کو بوسہ دیا جس نے رومیوں کے بادشاہ قیصر کے دربار میں اسلام کی عظمت کے ان مٹ نقوش چھوڑ دیئے تھے۔ دراصل وہ ایک جنگ میں اپنے مجاہد ساتھیوں کے ہمراہ رومیوں کے قیدی بن گئے تھے اور قیصر نے ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر مسلمانوں کا کوئی اہم فرد قید ہو تو اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہؓ ان صحابہ اکرامؓ میں سے تھے جنہوں نے مکہ میں بہت آغاز ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا' اس لیے انہیں رومیوں کے بادشاہ قیصر کے سامنے پیش کر دیا گیا اور قیصر انہیں عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کرتا رہا لیکن کام یاب نہ ہو سکا۔ آپؓ اس کی طرف سے دی جانے والی ہر اذیت کے باوجود اپنے مذہب اسلام پر ثابت قدم رہے۔

حفیظ الرحمان حسن

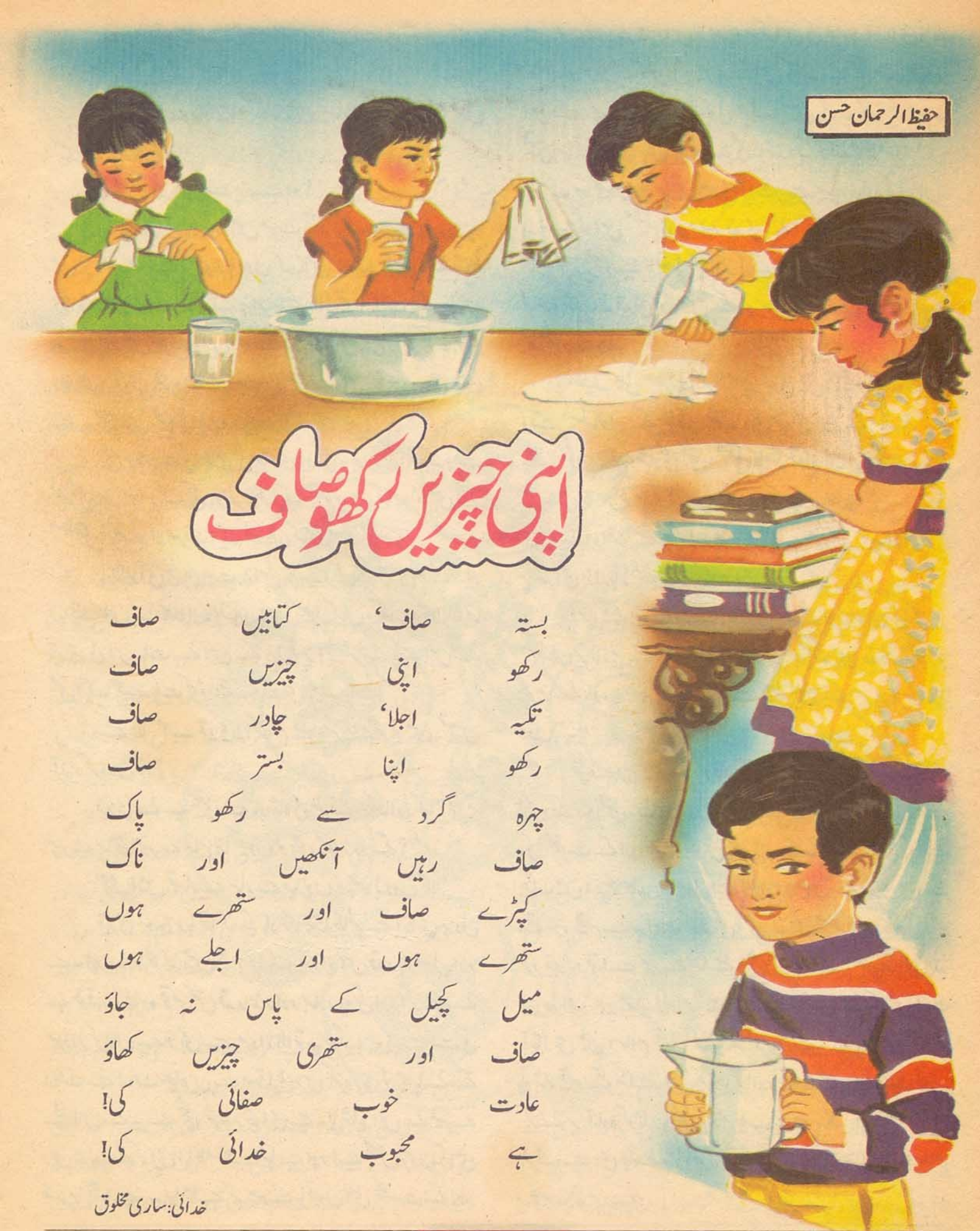

اپنی چیزیں رکھو صاف

بستہ صاف، کتابیں صاف
رکھو اپنی چیزیں صاف
تکیہ اجلا، چادر صاف
رکھو اپنا بستر صاف
چہرہ گرد سے رکھو پاک
صاف رہیں آنکھیں اور ناک
کپڑے صاف اور ستھرے ہوں
ستھرے ہوں اور اجلے ہوں
میل کچیل کے پاس نہ جاؤ
صاف اور ستھری چیزیں کھاؤ
عادت خوب صفائی کی!
ہے محبوب خدائی کی!

خدائی: ساری مخلوق

قبر کا بھوت

محمد یونس حسرت

اٹلی کے مشہور شہر پالرمو کے قریب ایک بیوہ رہتی تھی جس کا نام ٹریسا تھا۔ اس بے چاری کا ایک ہی لڑکا تھا جو پرلے درجے کا احمق اور بدھو واقع ہوا تھا۔ اس لڑکے کا نام بے پی تھا۔ ٹریسا بے پی کی تمام حماقتوں اور بے وقوفیوں کے باوجود اس سے بڑا پیار کرتی تھی۔ کیوں کہ وہ آخر کو اس کی ماں تھی۔ مگر بے پی کی نت نئی حماقتوں نے اس بے چاری کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ابھی اگلے ہی دن کی بات ہے ٹریسا بازار گئی اور جاتے ہوئے بے پی کو انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی کی نگرانی کرتے رہنے کی تاکید کر گئی۔ اس نے کہا: "بے پی! ذرا مرغی کا دھیان رکھنا اور اسے اس کے دڑبے سے باہر نہ جانے دینا۔ وہ اگر انڈوں پر نہ بیٹھی تو انڈے ٹھنڈے ہو کر خراب ہو جائیں گے اور ہمارے کسی کام کے نہیں رہیں گے' اور پھر ان سے چوزے بھی نہیں نکلیں گے۔ ہم انڈوں سے بھی جائیں گے اور چوزے بھی ہمارے ہاتھ نہیں آئیں گے۔

"تم فکر نہ کرو ماں!" بے پی نے یقین دلایا "جیسے تم نے کہا ہے میں ویسے ہی کروں گا"۔

چناں چہ اس نے ایسے ہی کیا۔ وہ مرغی کے دڑبے کے عین سامنے بیٹھ گیا اور اس کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ تو اپنے خیال میں مرغی کا دھیان رکھ رہا تھا مگر مرغی کو اس کا گھور گھور کر دیکھنا پسند نہیں آیا۔ پہلے تو اس نے بے چینی محسوس کرتے ہوئے کڑ کڑ کی' پھر ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑائے' اور آخرکار زور زور سے کڑ کڑ' کٹاک کٹاک کرتے ہوئے اور پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے وہ انڈوں پر سے اٹھی اور بے پی کے سر پر سے اڑتی ہوئی دڑبے سے باہر نکل گئی۔ بے پی مرغی کی اس اچانک حرکت سے گڑ بڑا کر پہلے تو پیچھے کی طرف گر گیا اور پھر سنبھل کر اس نے مرغی کو پکڑنے کی کوشش کی تو اس کی دم کے پر اس کے ہاتھ میں آئے۔ خوف زدہ مرغی پھڑ پھڑا کر پہلے صحن میں چکر کاٹتی رہی اور پھر بڑے دروازے سے باہر گلی میں نکل گئی۔

"اری نامراد!" بے پی نے چلا کر کہا "تو تو بڑی کام چور ہے۔ اچھا اگر تو انڈوں پر نہیں بیٹھتی تو تمہاری جگہ میں انڈوں پر بیٹھتا ہوں تاکہ وہ ٹھنڈے ہو کر خراب نہ ہو جائیں۔ ایسا ہوا تو میری ماں سخت ناراض ہو گی"۔

چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس کا نتیجہ جو نکلنا تھا

وہ نکلا۔ تمام کے تمام انڈے ٹوٹ کر ضائع ہو گئے۔

ٹریسا بازار سے واپس آئی تو ٹوٹے ہوئے انڈے دیکھ کر اس کا طیش میں آنا ایک قدرتی بات تھی مگر جب بے پی نے کمال سادگی سے اسے بتایا کہ کس طرح اس نے مرغی کی نگرانی کی تھی اور کس طرح مرغی انڈوں پر سے اڑ کر باہر نکل گئی تھی اور کس طرح مرغی کی بجائے وہ خود انڈوں پر بیٹھ گیا تھا تاکہ وہ ٹھنڈے ہو کر خراب نہ ہو جائیں تو ٹریسا نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پھر اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی "چپ ہو جاؤ بے پی! مجھے اور کچھ نہ سناؤ۔ جاؤ جا کر کپڑے بدلو اور باہر جا کر کھیلو"۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ٹریسا نے صحن میں لگی ہوئی انگور کی بیلوں سے انگور توڑ کر ایک ٹوکری بھری اور بے پی کو یہ ٹوکری دے کر بازار بھیجا' اور ساتھ ہی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بے پی! اب کے کوئی حماقت نہ کرنا اور یہ انگور معقول قیمت پر فروخت کرنا"۔

بے پی نے انگوروں کی ٹوکری سنبھال کر بازار کا رخ کیا۔ بازار پہنچ کر اس نے ایک جگہ ٹوکری رکھتے ہوئے انگور' میٹھے انگور' ہانک لگائی ہی تھی کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا اور ایک نظر انگوروں پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

"میٹھے انگور! کون کہتا ہے کہ یہ انگور میٹھے ہیں۔ یہ تو شکل صورت سے ہی کھٹے معلوم ہوتے ہیں۔ کھٹے بھی اور کچے بھی۔ تم بھی بڑے احمق ہو جو یہ گھٹیا قسم کے انگور بیچنے آگئے ہو۔ یہ تو دو کوڑی کے بھی نہیں ہیں!"۔

اس شخص نے اور بھی کئی باتیں کیں جو اسی قسم کی تھیں۔ نتیجہ ان باتوں کا یہ ہوا کہ بے پی نے وہ انگور برائے نام قیمت پر اسی شخص کے ہاتھ فروخت کر ڈالے۔ وہ دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ ان فضول اور خراب انگوروں سے اس کی جان چھوٹی۔ مگر جب اس نے وہ چند سکے گھر لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھے جو وہ شخص انگوروں کی قیمت کے طور پر دے گیا تھا تو ماں سر پیٹ کر رہ گئی۔ "ارے بدھو کہیں کے! وہ عین تمہاری آنکھوں کے سامنے تم سے انگوروں کی پوری ٹوکری ہتھیا لے گیا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ ذرا سی زبان ہلائی اور اس کے ذرا سا زبان ہلانے سے تم مان گئے کہ ہمارے انگور کسی کام کے نہیں"۔

"نہیں نہیں ماں!" بے پی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے ذرا سی زبان تو نہیں ہلائی تھی بلکہ کئی بار کہا تھا کہ یہ انگور خراب ہیں"۔

ٹریسا طیش میں آگئی اور طیش میں آکر اس نے بے پی کو دو تین ہاتھ جڑ دیئے۔ مگر جب مار کھا کر بے پی رونے لگا تو اسے اپنی حرکت پر خود ہی افسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے روتے ہوئے بے پی کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ اس کے آنسو پونچھنے اور پھر پیار سے اس کے بالوں اور گالوں کو سہلانے لگی۔ کچھ بھی سہی! بے پی اس کا بیٹا تھا اور وہ بے پی کی ماں تھی!

پھر ایک روز ٹریسا نے ایک کپڑا بے پی کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔ "بے پی! یہ بڑا عمدہ کپڑا ہے اور میں نے اسے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ تم اسے پالرمو کے بازار میں لے جاؤ اور اسے فروخت کر دو۔ اس کی قیمت کے طور پر چاندی کے پانچ سکے ضرور مل جائیں گے۔ مگر خیال رکھنا' اب کے تم کسی کی باتوں میں نہ آجانا اور ہر ایسے شخص سے دور رہنا جو تمہیں اپنی زبان کے چکر میں ڈالنے کی کوشش کرے"۔

"میں پوری احتیاط کروں گا ماں! بے پی نے وعدہ کیا۔

بے پی نے کپڑا سنبھال کر بازار کا رخ کیا اور بازار میں پہنچ کر ہانک لگائی۔ "کپڑا! بڑا عمدہ کپڑا!"

اس نے ہانک لگائی ہی تھی کہ ایک شخص نے اس کا بازو تھام لیا اور روکتے اور کپڑے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری بیگم یہ کپڑا دیکھنا پسند کرے گی اور پسند آگیا تو خرید بھی لے گی کیا تم...."

"بس بس!" بے پی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گا"۔

وہ اس شخص سے اپنا بازو چھڑا کر چند قدم ہی آگے

بڑھا تھا کہ ایک عورت نے اسے روکتے اور ایک نظر کپڑے پر ڈالتے ہوئے کہا "ارے لڑکے! بڑا پیارا کپڑا ہے یہ تو' کتنے پیسے لو گے اس کے؟"

"جاؤ جاؤ اپنا کام کرو" بے پی نے کسی قدر ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کہا "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اس طرح مجھے اپنی زبان کے چکر میں ڈال کر مجھ سے یہ کپڑا ہتھیا لو گی۔ میری ماں نے مجھے تم جیسوں ہی سے دور رہنے کی تاکید کی ہے"۔

وہ عورت چلی گئی اور بے پی جی ہی جی میں خوش ہونے لگا کہ اس نے اپنی ماں کی نصیحت پر پورا پورا عمل کیا ہے مگر بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ بے پی نے ہر اس خریدار کو بھگا دیا جس کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلتا تھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شام ہونے کو آئی تو کپڑا اسی طرح بے پی کے ہاتھ میں تھا۔ سارا دن بازار کے چکر پہ چکر لگاتے بے پی تھک گیا تھا اور کپڑا فروخت نہ ہو سکنے کی وجہ سے اسے یہ تھکاوٹ کچھ اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو بے پی کپڑا بغل میں دبائے گھر کی طرف واپس ہوا۔ راستے میں ایک باغ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک کونے میں پتھر کا ایک بنچ پڑا دیکھا جس کے قریب ہی زرد چہرے والا ایک آدمی سفید لباس پہنے کھڑا تھا۔ تھکاوٹ کے احساس کی وجہ سے بے پی کے قدم جیسے اپنے آپ بنچ کی طرف اٹھ گئے۔ قریب جا کر بے پی نے زرد چہرے اور سفید لباس والے آدمی کو مخاطب کیا "کیوں جناب! میں بیٹھ سکتا ہوں یہاں؟"

آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا مگر بے پی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس شخص نے سر ہلا کر اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے۔ بے پی "شکریہ" کہتے ہوئے دھم سے بنچ پر بیٹھ گیا اور ستانے لگا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد بے پی نے نگاہیں اٹھائیں اور دیکھا کہ وہ آدمی وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ بے پی کو کچھ خیال آیا اور اس نے اپنی بغل سے کپڑا نکال کر جیسے اسے دکھاتے ہوئے کہا "یہ بڑا عمدہ کپڑا ہے میاں! میری ماں نے اسے بڑی محنت سے تیار کیا ہے؟ کیا تم اسے خریدو گے؟"

بے پی کی اس بات پر بھی اس آدمی نے کچھ نہیں کہا۔

بے پی کا دل خوشی سے جھوم سا گیا۔ اب آ کے اسے ایک آدمی ملا تھا جو اسے اپنی باتوں میں لگانے اور اسے زبان کے چکر میں ڈال کر اس سے کپڑا ہتھیانے والا نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس لیے بے پی نے کہا "میں اسے چاندی کے پانچ سکوں کے عوض بیچنے کو تیار ہوں"۔

اپنی اس بات کے جواب میں بے پی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس آدمی نے "ہاں" کے انداز میں سر ہلایا ہے۔ بے پی خوش خوش بنچ سے اٹھا اور اس نے وہ کپڑا اس آدمی

کے بازوؤں پر ڈال دیا۔

اب وہ اس انتظار میں تھا کہ وہ آدمی اس کپڑے کی قیمت ادا کر دے۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے کہا "چاندی کے پانچ سکے نکالیے جناب!"

اس آدمی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو بے پی نے کسی قدر زور سے کہا: "کپڑے کی قیمت دیجئے جناب!"

اب بھی اس پر آدمی نے کچھ نہیں کہا۔ اس پر بے پی نے کسی قدر غصے سے کہا "اگر تم قیمت نہیں دو گے تو میں اپنا کپڑا واپس لے لیتا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے کپڑے کا ایک سرا پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ اس آدمی کی انگلیوں میں پھنس گیا اور جھرر جھرر کی آواز کے ساتھ پھٹنے لگا۔

"ارے! یہ تم نے کیا کر دیا ہے؟" بے پی چیخا "مجھے قیمت ادا کرو یا کپڑا واپس کرو فوراً!"

اس پر بھی آدمی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا اور کپڑا بدستور اس کی انگلیوں میں پھنسا رہا۔ اس پر بے پی کو اور غصہ آگیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اتفاق سے بنچ کے بالکل قریب ہی زمین پر ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ بے پی نے لپک کر وہ ڈنڈا اٹھا لیا اور چیخ کر کہنے لگا "میرا کپڑا مجھے واپس کر دو، نہیں تو دیکھو میں تمہارا کیا حال کرتا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اس آدمی کے بازوؤں پر زور سے تین چار ڈنڈے جڑ دیئے۔ چٹاخ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کے دونوں بازو الگ ہو گئے اور ان کے سینکڑوں ہزاروں سفید ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔

"ارے!" بے پی نے حیرانی اور خوف کی ملی جلی آواز میں کہا اور اسی کیفیت میں اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر انگلیوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے اس آدمی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ آدمی اب بھی پہلے کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ سوائے اس کے کہ اب اس کے دونوں بازو اس کے جسم پر موجود نہیں تھے۔ اس کے چہرے سے کسی درد یا تکلیف کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔ بے پی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اسے قریب سے دیکھا تو اس پر ساری حقیقت ظاہر ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "تو تم فریب کرتے رہے ہو میرے ساتھ! تم آدمی نہیں، محض کھڑیا مٹی کے مجسمے ہو۔ شکر ہے میں نے تمہارا حساب برابر کر دیا ہے اور اب تمہارے پاس وہ بازو نہیں رہے جن کے ذریعے تم دوسروں کو دھوکا دے سکو"۔

عین اسی وقت باغ کے پیچھے عمارت میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک عورت نے بلند آواز سے کہا "یہ کون ہے میرے مجسمے کے پاس؟"

"یہ میں ہوں" بے پی نے جواب میں چیخ کر کہا "تمہارے بدمعاش مجسمے نے میرا کپڑا چوری....."

"چور، چور!" عورت ایک دم گلے کی پوری طاقت سے چلائی "پولیس! پولیس!"

"تم میری بات نہیں سمجھ رہیں!" بے پی نے بھی اسی طرح گلے کی پوری طاقت سے چیخ کر کہا "میں چور نہیں ہوں، چور تو ....."

مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عورت بے پی کی آواز پر کان دھرنے کے بجائے برابر پولیس کو مدد کے لیے پکارے جا رہی تھی۔ بے پی نے سوچا کہ پولیس بھی شاید اس کی بات پر کان نہیں دھرے گی۔ اس نے مجسمے سے اپنا کپڑا اتار کر بغل میں دبایا اور پھر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بھاگتے بھاگتے وہ ایک موڑ مڑا تو اسے اپنے سامنے ایک گرجا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا گرجے کے اندر جا گھسا۔ وہ بری طرح تھکا ہوا تو تھا ہی، سنگ مرمر کی ایک سل پر چڑھ کر اور فروخت کے لیے لایا ہوا کپڑا اپنے گرد لپیٹ کر لیٹا تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا کہ دبی دبی آوازوں اور جھن جھن، ٹھن ٹھن کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک طرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ دو آدمی سکوں کے ایک ڈھیر پر

جھکے ہوئے ان سکوں کو آپس میں بانٹ رہے ہیں۔

"بڑے زور کا ہاتھ مارا ہے رات ہم نے بھی" ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "ایک میرا' ایک تمہارا' ایک میرا ایک تمہارا' ٹھن ٹھن! چھن چھن!"

بے پی نے آنکھیں ملتے ہوئے جماہی لی۔ "یہ کیسی آواز تھی؟" ایک آدمی نے دوسرے سے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

بے پی اٹھ کر سنگ مرمر کی سل پر بیٹھ گیا۔ یہ سل اصل میں کسی بہت پہلے مرے ہوئے شخص کی قبر پر لگا ہوا پتھر تھا۔ اس نے پھر جماہی لی اور اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کپڑا اپنے آپ اس کے بازوؤں پر پھیل گیا جو وہ فروخت کرنے کے لیے لے کر نکلا تھا اور جسے اوڑھ کر وہ سو گیا تھا۔ اپنے بازو پھیلاتے ہوئے اس نے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا جو سکے بانٹ رہے تھے "کیا اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے؟"

دونوں آدمیوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خوف سے چیخے "بھوت! بھوت!"

انہوں نے سکے وہیں چھوڑے اور وہاں سے چمپت ہو گئے۔

"ٹھہرو' ٹھہرو!" بے پی نے چلا کر کہا "میں بھوت نہیں ہوں! میں بھوت نہیں ہوں!"

مگر وہ تو بھاگ گئے تھے اور ذرا کی ذرا میں کہیں کے کہیں پہنچ گئے تھے۔ اب تو وہاں صرف وہ سکے ہی رہ گئے تھے جو موم بتی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ بے پی نے ان سکوں کو سمیٹا اور کپڑے میں باندھ لیا۔ وہ کپڑا اب نہ سفید رہا تھا نہ عمدہ اور نہ صحیح سالم ہی تھا مگر وہ اور کیا کرتا۔ ان سکوں کو باندھنے کے لیے اس کے پاس اور کچھ تھا بھی تو نہیں۔

"میرا خیال ہے میں ان سکوں کو گھر ہی لے جاؤں" بے پی نے اپنے آپ سے کہا۔ میری ماں ہی کو علم ہو گا کہ اس رقم کا کیا کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے سکوں کی گٹھڑی اٹھائی اور گھر کی طرف چل دیا۔

ٹریسا نے بے پی کو آتے دیکھا تو دوڑ کر دروازے پر آئی۔ "بے پی' تم کہاں رہے ہو؟"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے بے پی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب اسے یہ احساس ہوا کہ بے پی ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہے تو اس نے اسے اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے اس

کپڑے کو ایک نظر دیکھا جو اس نے بے پی کو فروخت کرنے کے لیے دیا تھا اور جو سفید اور عمدہ کپڑے کے بجائے اب گندی سی گٹھڑی کی صورت میں نظر آرہا تھا۔

"یہ تم نے میرے ایسے پیارے کپڑے کا حال کر دیا ہے" ٹریسا نے حیرانی اور افسوس بھرے لہجے میں کہا "تم نے اسے فروخت کیوں نہیں کیا بے پی؟"

"ماں!" بے پی نے جواب میں کہا "بات کچھ یوں ہوئی ماں ....."

اور پھر اس نے شروع سے اپنی ساری کہانی سنا ڈالی۔ جب وہ باغ میں مجسّمے کے بازو توڑنے کی کیفیت بیان کر رہا تھا تو ٹریسا کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا اور وہ کہنے لگی "پولیس! اس عورت نے پولیس کو بلوایا تھا؟ تو کیا اب پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے؟"

"نہیں ماں! ایسی کوئی بات نہیں" بے پی نے کہا۔

اور پھر اسے گرجے میں چھپنے اور ان آدمیوں کی بابت بتایا جو اسے بھوت سمجھ کر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ وہ بولا: "میں نے تو انہیں یہ بتانے کی بہت کوشش کی کہ میں بھوت نہیں ہوں مگر وہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ وہاں سے تو میں ان کے چھوڑے ہوئے یہ سکے جمع کر کے اپنے ساتھ یہاں لے آیا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے بے پی نے گٹھڑی کھول دی تاکہ اس کی ماں اس میں بندھے ہوئے سونے اور چاندی کے سکوں کے ڈھیر کو دیکھ سکے۔

ٹریسا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اس نے جھک کر کپڑے کے چاروں سرے پکڑتے ہوئے سکوں کو دوبارہ گٹھڑی میں باندھ دیا اور بے پی کا بازو تھام کر اسے کھینچتے اور باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "آؤ میرے ساتھ! ہم اس گٹھڑی سمیت سیدھے پولیس کے پاس جائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چور بھاگتے ہوئے یہ رقم چھوڑ گئے تھے مگر پھر بھی یہ رقم ہماری نہیں ہے اور نہ اس پر ہمارا کوئی حق بنتا ہے۔ پولیس ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہے کہ اس رقم کا کیا کرنا چاہیے۔ اور پھر ہم دیکھیں گے کہ مجسّمے کے بازو توڑ کر تم نے اس عورت کا جو نقصان کیا ہے، ہم اس کی تلافی کیسے کر سکتے ہیں۔ ہائے ہائے بے پی! تم روز میرے لیے نئی نئی پریشانیاں اور نئی نئی مصیبتیں کھڑی کرتے رہتے ہو!"

مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں پریشانی اور مصیبت کی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ بے پی کے لیے اور نہ اس کی ماں کے لیے۔ ہوا یہ کہ ٹریسا نے جو رقم پولیس کے حوالے کی وہ پوری کی پوری وہی رقم تھی جو ایک سوداگر کی پالرمو سے گزرتے ہوئے چوری ہو گئی تھی۔ وہ سوداگر اپنی ساری رقم دوبارہ صحیح سلامت پا کر اس قدر خوش اور دونوں ماں بیٹے کا اس قدر شکر گزار ہوا کہ اس نے انہیں انعام کے طور پر ایک معقول رقم دی۔ اس میں سے کچھ رقم سے انہوں نے اس مجسّمے کی مرمت کرائی جو بے پی نے توڑ دیا تھا اور باقی رقم سے وہ کئی مہینوں تک آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔

(لی وندھم LEE WYNDHAM کی کہانی کا ترجمہ)

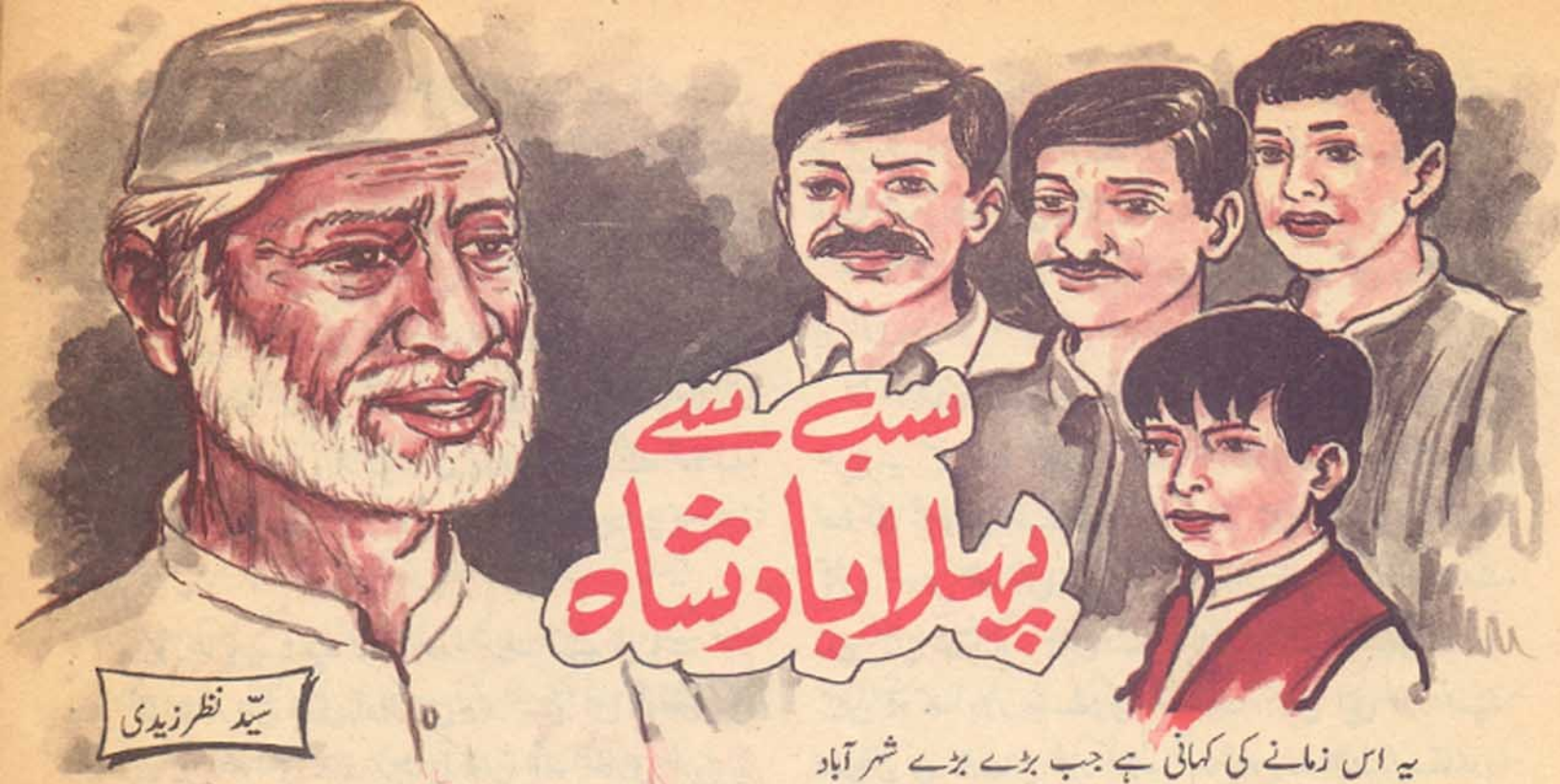

سب سے پہلا بادشاہ

سید نظر زیدی

یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب بڑے بڑے شہر آباد نہ ہوئے تھے۔ نہ قسم قسم کی چیزیں تیار کرنے کے کارخانے تھے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ایسی ہی ایک بستی میں ایک کسان رہتا تھا جس کے چار بیٹے تھے۔

اگر محنتی اور عقل مند ہو تو ایک آدمی بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تو چار بھائی تھے۔ اپنے کھیتوں میں محنت اور توجہ سے کام کرتے تو کسی چیز کی کمی نہ رہتی۔ وہ خوب امیر ہو جاتے، لیکن بدقسمتی سے ان بھائیوں میں تین بالکل نکمے اور نالائق تھے۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ دن رات کھیل تماشوں میں لگے رہتے تھے۔ باپ بہت سمجھاتا "بیٹو، فصل بونے کا موسم ہے اپنے کھیتوں میں کام کرو ہل چلاؤ، بیج بکھیرو، پانی دو۔ اللہ فضل کرے گا۔ اچھی پیداوار ہو گی اور سب آرام سے زندگی گزارو گے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے گا۔ سب تمہاری عزت کریں گے"۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتے اور فصل بونے کا موسم گزر جاتا۔

ان تینوں نکموں کا تو یہ حال تھا، لیکن کسان کا چوتھا بیٹا جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا ان کی طرح ناسمجھ اور نکما نہ تھا۔ وہ محنتی بھی تھا اور سمجھ دار بھی۔ اپنے باپ کے حکم کے مطابق کھیتوں میں کام کرتا رہتا اور اس کی دن رات کی محنت سے اتنی پیداوار ہو جاتی کہ سب کو دو وقت کی روکھی سوکھی مل جاتی۔

کسان کے اس محنتی اور سمجھدار بیٹے کا نام دلدار تھا۔ اچھی عادتوں کے ساتھ اللہ نے اسے شکل صورت بھی بہت اچھی دی تھی۔ بوڑھا باپ تو اس سے محبت کرتا ہی تھا، گاؤں کے اور لوگ بھی اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ جہاں جاتا اسے عزت سے پاس بٹھایا جاتا اور خاطر مدارات ہوتی۔ اگر کوئی اسے اچھا نہ سمجھتا تھا تو وہ اس کے بڑے بھائی تھے۔ اپنی کم عقلی کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہمارا یہ بھائی بہت چالاک ہے۔ اس نے اپنی چالاکی کی وجہ سے سب کو اپنا طرف دار بنا لیا ہے، چناں چہ اسی غلط فہمی کے باعث اسے ستاتے اور پریشان کرتے رہتے تھے۔ جب بھی اسے دیکھتے یونہی کوئی کام اس کے ذمے لگا دیتے۔ جا بے دلدارے یہ کام کر، جا بے دلدارے وہ کام کر، اور عمر میں چھوٹا اور کمزور ہونے کی وجہ سے اسے ان کے حکم احکام ماننے پڑتے۔ اس بھاگ دوڑ میں بے چارہ تھک کر چور ہو جاتا۔ اس کا دل چاہتا وہ بھی تھوڑی دیر آرام کرے، لیکن اس کے بھائی ایسا موقع ہی نہ دیتے تھے۔

بھائیوں کے اس برے سلوک کی وجہ سے آخر دلدار تنگ آ گیا اور ایک دن اس نے اپنے باپ سے ان کی شکایت کر ہی دی۔ دیکھیں نا ابا جی! میرے بھائی کھیتی باڑی کا تو کوئی کام کرتے ہی نہیں۔ سب مصیبتیں میں ہی اٹھا رہا ہوں' لیکن پریشانی یہ ہے کہ اپنے ذاتی کام بھی مجھ ہی سے کراتے ہیں' اٹھ کر پانی تک نہیں پیتے۔ مجھ پر حکم چلاتے ہیں۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ صرف مجھے تھکانے اور پریشان کرنے کے لیے حکم چلاتے رہتے ہیں۔ یہ کام کر' وہ کام کر"۔

بوڑھا باپ اپنے لائق اور شریف بیٹے کی بات غور سے سنتا رہا پھر رنج بھری آواز میں بولا "بیٹے' ان نالائقوں کی وجہ سے میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔ اگر تمہاری طرح یہ تینوں بھی محنتی اور سمجھ دار ہوتے تو پورے گاؤں میں ہم سے زیادہ کوئی امیر نہ ہوتا۔ ہمارے پاس تیز رفتار خوب صورت گھوڑوں والی گاڑی ہوتی' ہم عمدہ پوشاکیں پہنا کرتے اور پیٹ بھر کر پھل اور مٹھائیاں کھاتے' لیکن اب اس بستی میں ہم سب سے غریب ہیں۔ اگر تم دن رات جان نہ کھپاؤ تو شاید بھیک مانگنے کی نوبت آجائے۔ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ تمہاری طرح وہ بھی محنت کریں لیکن یہ میرا کہنا نہیں مانتے۔ میں بوڑھا نہ ہو گیا ہوتا تو ان سے زبردستی کام کرواتا۔ لیکن اب مجبور ہوں۔ ان سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتا۔ پیارے بیٹے' میری طرح تم بھی صبر کرو جس طرح اب تک تکلیفیں اٹھاتے چلے آرہے ہو اسی طرح اپنے کام میں لگے رہو۔ ویسے یہ بات تمہیں یقین سے بتا رہا ہوں کہ ان تینوں کے مقابلے میں جیت تمہاری ہی ہو گی۔ ایک وقت آئے گا جب اللہ پاک تمہیں بہت عزت اور شان دے گا اور یہ تینوں اپنی بدبختی پر روئیں اور پچھتائیں گے۔ پیارے بیٹے' یہ بات ایسے یقین کے ساتھ میں اس لیے کہ رہا ہوں کہ جس اللہ نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اس نے زندگی گزارنے کا ایک ایسا قانون بھی بتایا ہے جو کبھی بدلتا نہیں' اور وہ یہ کہ جو لوگ خوب محنت کرتے اور اچھی عادتیں اپناتے ہیں ہر لحاظ سے فائدے میں رہتے ہیں اور جو نکمے نالائق بن کر زندگی گزارتے ہیں کھلے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا"۔

"شاید ایسا ہی ہوتا ہو" دلدار نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

"شاید نہیں میرے بیٹے یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ کا انگارہ ہاتھ میں لینے والا ٹھنڈک محسوس کرے اور برف ہاتھ میں اٹھانے والے کو تپش محسوس ہو۔ اسی طرح نیکی کے راستے پہ چلنے والا گھاٹے میں نہیں رہتا اور برائی کے راستے پر چلنے والے کو فائدہ نہیں ہوتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اپنی اور اپنے بھائیوں کی حالت پر غور کرو۔ تم ماشاء اللہ محنت کرتے اور سب کے کام آتے ہو تو اس کے نتیجے میں پوری طرح تندرست ہو۔ تمہارے بدن میں شیر جیسی طاقت ہے۔ لیکن تمہارے مقابلے میں تمہارے بھائی بے کار پڑے رہتے ہیں۔ نہ کسی کی مدد کرتے ہیں نہ کسی کے کام آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے جسم بھدے اور پھس پھسے ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی مشکل وقت آپڑے تو یہ اپنی جان بھی نہ بچا سکیں گے اور یہ تو وہ بات ہے جو ظاہری طور پر نظر آتی ہے۔ نیکی اور برائی کے بے شمار نتیجے ایسے ہیں جو ہمیں نظر تو نہیں آتے' لیکن ہماری زندگی پر انہی کے اچھے یا برے اثر پڑتے ہیں"۔ بڑے میاں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

اپنے باپ کی یہ بات سن کر دلدار خاموش رہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ اندازہ کر کے اس کے باپ نے کہا "بیٹے' ہم نے جو کچھ کہا ہے اپنے آپ کو ان باتوں کا یقین دلاؤ۔ ہماری دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اللہ کے قائم کئے ہوئے ایک قانون کے مطابق ہو رہا ہے اور یہ معاملہ قریب قریب ایسا ہی ہے جیسا کھیتوں میں فصل اگنے کا ہے۔ تم کھیت تیار کر کے بیج بکھیرتے ہو تو فوراً ہی پودے نہیں اگ آتے۔ بلکہ اس میں ایک مقررہ وقت لگتا ہے۔ بیج بکھیرنے اور پانی دینے

کے کچھ دن بعد ننھی سی کونپل زمین سے پھوٹتی ہے پھر پودا بنتا ہے۔ اس پر دانوں سے بھری ہوئی بالیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ پکتی ہیں اور تب کہیں کسان اس قابل ہوتا ہے کہ فصل کاٹ کر اپنے گھر لائے۔ سو تم جو اچھے کام کر رہے ہو نا ان کا بھی ایک نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ اگر اسی طرح نیک اور محنتی رہے تو ایک دن اچھی فصل کاٹو گے اور اپنے ان نکمے کام چور بھائیوں سے بہت اچھے بن جاؤ گے"۔

دلدار اب بھی سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ باتیں سن کر مطمئن نہیں ہوا۔

"اچھا چلو تم ہماری باتوں کو ٹھیک نہ سمجھو' ایک خوش خبری سنو' ہماری بستی کے علاوہ آس پاس کی کچھ اور بستیوں کے بڑوں' بوڑھوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ کسی قابل نوجوان کو اپنا سردار بنا لیا جائے۔ تم دیکھ رہے ہو حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑے بھی ہونے لگے ہیں اور یہ ضرورت بھی محسوس کی جا رہی ہے کہ کھیتوں اور باغوں کی پیداوار کا ایسا انتظام ہو جس سے سب کو فائدہ پہنچے' چناں چہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی بہت قابل نوجوان کو سردار بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سب اس کا حکم مانیں گے اور اس کی عزت کریں گے"۔

"تو کیا آپ مجھے سردار بنوا دیں گے؟" دلدار نے بہت خوش ہو کر سوال کیا۔

"بالکل نہیں' برخور دار یہ ایک بہت بڑا عہدہ ہو گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے آدمی کو سردار چنا جائے جو واقعی بہت قابل اور بہادر ہو۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ اگلے مہینے چاند کی چودہ تاریخ کو سب بستیوں کے نوجوانوں کے درمیان گھوڑا دوڑانے' تلوار چلانے اور تیر کا نشانہ لگانے کے مقابلے ہوں گے اور جو نوجوان یہ مقابلے جیت لے گا وہ اس پورے علاقے کا سردار بن جائے گا۔ میں دعا کروں گا خدا کرے تم کامیابی حاصل کرو"۔ بڑے میاں نے کہا۔ وہ یوں خوش نظر آ رہے تھے جیسے انہیں دلدار کے کامیاب ہونے کا پکا یقین ہو۔

دلدار نے اسی دن سے مقابلوں میں حصہ لینے کی تیاری شروع کر دی اور دن رات محنت کر کے اس قابل بن گیا کہ فتح حاصل کرنے کے یقین کے ساتھ میدان میں اتر سکے۔ ایک ایک کر کے دن گزرتے گئے اور آخر مقابلے کا دن آگیا۔ علاقے کی ساری بستیوں کے نوجوان ایک کھلے میدان میں اکٹھے ہوئے اور مقابلے شروع ہو گئے۔ دلدار بھی ان میں شامل تھا اور اپنے مضبوط جسم اور چمکتے چہرے کی وجہ سے سب کا سردار نظر آ رہا تھا۔

فیصلہ کرنے والے اونچی جگہ بیٹھے تھے اور ان میں دلدار کے والد صاحب بھی تھے۔ مقابلہ ختم ہوتا تھا تو وہ آپس میں مشورہ کر کے ایک کاغذ پر نمبر لکھتے جاتے تھے۔ انہوں نے نوجوانوں کو بتا دیا تھا کہ ان مقابلوں میں اصل فاتح اسے سمجھا جائے گا جو کسی قسم کی چالاکی یا بے ایمانی نہ کرے گا۔ ہمارے نزدیک اصل طاقت اور قابلیت ایمانداری ہے۔

جو وقت مقرر کیا گیا تھا اس پر مقابلے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے گھڑ دوڑ ہوئی۔ اس کے بعد شمشیر زنی' یعنی تلوار چلانے کا مقابلہ ہوا۔ پھر تیر اندازی کا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ دلدار ایک مقابلے میں بھی اول نہ آیا۔ گھڑ دوڑ میں اس وجہ سے نہ جیت سکا کہ اس کا گھوڑا کمزور تھا۔ تلوار چلانے اور تیر اندازی میں اس لیے اول نہ آسکا کہ اس کی ساری زندگی اپنے کھیتوں میں کام کرتے اور اپنے بھائیوں کی خدمت میں گزری تھی۔ تلوار اور تیر کمان کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ مقابلوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے بعد چند دن مشق کر سکا تھا۔

مقابلے ختم ہونے کے بعد ان میں اول آنے والے نوجوانوں کو بھی اونچی جگہ بٹھا دیا گیا۔ ان کی تعداد تین تھی جو ایک ایک مقابلے میں اول آئے تھے۔ جب کہ سردار بننے کے لیے کسی ایک نوجوان کا تینوں مقابلوں میں اول آنا ضروری تھا۔

اب آسان بات یہ تھی کہ ان تینوں میں مقابلہ کرا دیا جاتا۔ لیکن جن بزرگوں کو فیصلہ کرنے کے لیے بٹھایا گیا تھا

انہوں نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا۔ وہ کافی دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر ان میں سے ایک اٹھا اور اونچی آواز میں بولا۔

"مقابلوں میں حصہ لینے والے نوجوانو اور یہ مقابلے دیکھنے والے بھائیو' جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ جیتنے والے تینوں نوجوانوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ اسے سردار بنا دیا جائے' کیوں کہ ان تینوں نے ایک ایک مقابلے میں کام یابی حاصل کی ہے اور ایک اور بات یہ ہے کہ ان تینوں ہی نے جیتنے کے لیے کچھ غلطیاں کی ہیں جو نہیں کرنی چاہیں تھیں۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے والے نوجوانوں میں صرف ایک نوجوان ایسا ہے جس نے کوئی غلطی یا چالاکی نہیں کی' لیکن وہ کسی ایک مقابلے میں بھی اول نہیں آیا۔ اگر وہ ایک مقابلے میں بھی اول آجاتا تو ہم اسے سردار بنا دیتے۔ کیوں کہ ایمانداری ہی ایک بڑی قابلیت ہے' بہرحال ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سردار چننے کے لیے ان مقابلوں سے ہٹ کر ایک مقابلہ اور کرایا جائے اور جو نوجوان یہ مقابلہ جیت لے اسے سردار بنا دیا جائے۔ اس مقابلے میں سب نوجوان حصہ لے سکتے ہیں' یعنی ان تین نوجوانوں کے علاوہ وہ بھی جو کسی طرح کی کام یابی حاصل نہیں کر سکے۔ میں ایک سوال کروں گا جو نوجوان اس کا بالکل ٹھیک جواب دے دے گا وہ سردار بن جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ کسی شخص میں سردار بننے کے لیے سب سے بڑی خوبی کیا ہونی چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں صرف ایک خوبی بتانی ہو گی اور وہ بھی مختصر لفظوں میں۔ سوال میں نے بیان کر دیا۔ اب ایک ایک نوجوان آئے اور اس اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر مختصر لفظوں میں جواب دے اور لوٹ کر اپنی جگہ بیٹھ جائے۔

بزرگ کی یہ بات سن کر پورے مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بھی خوش ہو گئے جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہم مقابلے سے نکل گئے ہیں اور نوجوانوں نے بزرگوں کے قریب والے بڑے پتھر پر کھڑے ہو کر جواب دینے شروع کر دیئے۔ جو جواب سب سے زیادہ دیا گیا وہ یہ تھا۔

"وہ بہادر' طاقت ور اور عقل مند ہو"۔

لیکن جب دلدار کا نمبر آیا تو اس نے کہا "میرے نزدیک تو سردار بننے کے لیے سب سے بڑی خوبی انصاف پسند ہونا ہے"۔

دلدار کا یہ جواب سن کر فیصلہ کرنے والے بزرگوں نے سبحان اللہ' سبحان اللہ کہ کر خوشی ظاہر کی۔ پھر وہی بزرگ اس کے پاس آگئے جنہوں نے سوال کیا تھا اور اس کا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اونچی آواز میں بولے "لوگو' سن لو یہ ہے وہ خوش قسمت نوجوان جس میں اس علاقے کا سردار بننے کی ساری خوبیاں ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ کہ یہ ایمان دار ہے۔ مقابلوں کے دوران میں اس نے ایک حرکت بھی ایسی نہ کی تھی جسے ہم غلط کہ سکتے اور یوں یہ نہ جیتنے کے باوجود سب سے اول رہا تھا۔ دوسری خوبی یہ کہ یہ دانائی اور عقل مندی میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ہم یہ بات مانتے ہیں کہ لڑائی کے ہنر اور طاقت ور جسم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ ایک سردار میں یہ اچھائیاں بھی ہونی چاہیں لیکن اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ چیزیں ایمان داری اور دانائی ہیں۔ یہی دونوں صفات اس دنیا کا نور ہیں۔ میں اس نوجوان کو مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ ایمان دار بھی ہے اور عقل مند بھی۔ ساتھ ہی آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے علاقے کا سردار بنا لیں۔ یقین ہے یہ بہت اچھا انتظام کرے گا اور صحیح معنوں میں سردار ثابت ہو گا۔ کیا آپ میری یہ درخواست قبول کریں گے؟"

بزرگ کے خاموش ہوتے ہی ہر طرف سے منظور ہے' منظور ہے کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک غریب نوجوان ایک بہت بڑے علاقے کا حاکم بن گیا۔

کہتے ہیں سرداری کا یہی عہدہ آگے چل کر بادشاہت بنا اور یوں ہم کہ سکتے ہیں کہ غریب کسان کا بیٹا دلدار دنیا کا سب سے پہلا بادشاہ بنا اور اسے یہ عزت اور عہدہ اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے ملا۔

چوزے اور موم بتی

نجمہ معراج

عدیل گھر میں سب بہن بھائیوں سے چھوٹا شرارتی اور تھوڑا نافرمان بچہ تھا۔ جو اس کے جی میں آتا کر گزرتا' چاہے اس میں ماں کی نافرمانی ہوتی ہو یا کسی بہن بھائی کا نقصان۔ قدرت نے اسے شکل تو اچھی دے رکھی تھی لیکن اس کی شرارتوں کی وجہ سے اس کے سامنے کے دو دانت وقت سے پہلے ہی جھڑ گئے تھے۔ اب ان دو دانتوں والی جگہ خالی تھی اور اس کے کلاس فیلو اس پر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

عدیل کافی ذہین تھا۔ وہ اب چوتھی میں پڑھتا تھا۔ اس سے اس کا بڑا بھائی جو پڑھائی میں ذرا کم زور تھا' عدیل والی کلاس میں ہی پڑھتا تھا۔ ان دونوں سے بڑی ایک بہن تھی۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی اور امی جان کے ساتھ گھر کے کام میں کافی مدد کرتی تھی۔ عجب اتفاق یہ تھا کہ وہ اپنی جماعت میں ہمیشہ ہی دوم پوزیشن حاصل کرتی تھی۔

عدیل کے والدین گاؤں میں رہتے تھے۔ عدیل کے پڑھائی میں تیز ہونے کے باوجود وہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے خوش نہیں تھے اور ہر وقت یہی سوچتے رہتے تھے کہ عدیل کس طرح اچھا بچہ بن سکتا ہے۔ گھر سے کوئی ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ان کی زرعی زمین تھی جہاں فصلوں کو پانی دینے کے لیے ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔

عدیل کے ابو وکیل تھے اور ان کے دادا ابو زمین پر کام کرواتے تھے۔ عدیل کے ابو کا عدیل اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ دن میں کھیتوں کا ایک چکر ضرور لگایا کریں۔ عدیل اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیتوں میں جاتا۔ خود ہی درخت پر چڑھ کر مسواک اتارتا۔ اور ٹیوب ویل میں نہاتا۔ اس کے ابو اسے درخت پر چڑھنے اور ٹیوب ویل میں نہانے سے ہمیشہ ہی منع کرتے لیکن وہ اپنی مرضی کرتا۔

عدیل پڑھتا بھی بہت تھا۔ جماعت میں بھی ہمیشہ اول آتا تھا۔ لیکن اس میں یہی ایک بری عادت تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتا تھا۔ بہن بھائیوں سے اکثر لڑتا اور اس وقت تک روتا رہتا جب تک وہ ان سے اپنا بدلہ نہ لے لیتا۔ بات بات پر ضد کرتا۔عدیل کی امی اس کی ان بری عادتوں سے بہت کڑھتی تھیں۔ پچھلی چھوٹی عید پر اس کی امی نے اسے کہا کہ اسکول والا کوٹ ابھی چند روز پہلے ہی تو آپ کے ابو لائے ہیں یہی عید پر پہن لو۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں اسکول یونی فارم عید پر نہیں پہنوں گا۔ مجھے ابو کے کوٹ جیسا کوٹ لے کے دو۔

کبھی رات کے وقت ضد کر لیتا کہ میں سویاں کھاؤں گا اور مسلسل روتا رہتا۔ روتے روتے یا تو سویاں پک جاتیں یا پھر اس کو نیند آجاتی۔ ماں بہت سمجھاتی کہ بیٹا اتنا نہ رویا کرو۔ اس طرح تم بڑے نہیں ہو سکو گے۔ رو رو کر چھوٹے رہ جاؤ گے۔ لیکن اسے کوئی اثر نہ ہوتا۔

عدیل آج جب اسکول پہنچا تو اسمبلی ہو رہی تھی۔ اسمبلی کا اختتام ہیڈ ماسٹر صاحب کی مختصر گفت گو سے ہوتا تھا۔ وہ ہر روز "ایک بات" کے نام سے اسکول کے طلبہ کو

کوئی اچھی سی نصیحت کرتے تھے۔ آج انہوں نے مائیک کے سامنے آکر کہا "عزیز طلبہ' آج کی بات کا عنوان ہے "کام یابی کا راز" جو بچے کائنات میں موجود چیزوں کو غور سے دیکھتے ہیں اور ان پر خوب غور و خوض کر کے ان سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کام یاب ہو جاتے ہیں۔ اسمبلی ہیڈ ماسٹر صاحب کی اس بات کے بعد ختم ہو گئی۔ عدیل بھی دوسرے بچوں کے ساتھ اپنی جماعت میں آگیا مگر وہ اسکول میں ساری چھٹی تک یہ سوچتا رہا کہ وہ کس چیز پر غور و خوض کرے تاکہ وہ بھی کام یابی حاصل کر سکے۔ کیوں کہ ہر میدان میں کام یابی حاصل کرنا اس کی اولین خواہش ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں بھی جہاں اسے کسی بات پر اپنی ہار محسوس ہوتی تھی وہیں رونے بیٹھ جاتا تھا۔

اسی دن مغرب سے کوئی گھنٹا پہلے سب بہن بھائیوں نے پروگرام بنایا کہ ابھی کھیتوں میں چلیں اور گنے لے کے آئیں۔ رات کو چوسیں گے۔ عدیل تو خیال آتے ہی سب سے آگے آگے کھیتوں کی طرف چل نکلا۔ باقی دونوں بہن بھائی اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

عدیل ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ سرخ سرخ بادل آسمانوں پر تیزی سے چھانا شروع ہو گئے۔ جیسے اگلے ہی لمحے آندھی آنے والی ہو۔ گاؤں کے قریب ہی کچھ جگہ خالی تھی جہاں لوگ کوڑا کرکٹ پھینک دیتے تھے اور وہاں سارا دن لوگوں کی مرغیاں پھرتی رہتی تھیں۔

بادل کے ساتھ ساتھ دور سے تیز ہوا کی آواز بھی آنا شروع ہو گئی۔ یک دم عدیل نے مرغیوں کی طرف دیکھا۔ اور وہیں کھڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ مرغیوں کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ تین مرغیوں نے علیحدہ علیحدہ کھڑے ہو کر کٹ کٹ کرنا شروع کر دیا۔ چوزے جو ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے کٹ کٹ کی آواز سنتے ہی سب حصوں میں بٹ گئے۔ جو چوزے جس مرغی کے تھے' اس کے پاس پہنچ گئے۔ ایک مرغی کے ساتھ دو چوزے تھے اور دوسری کے ساتھ سات۔ جب کہ تیسری مرغی کے ساتھ بارہ چوزے تھے۔ وہ تینوں اپنے اپنے بچوں کو ایک ہی آواز پر اکٹھا کر کے گھر کی طرف چل دیں۔

یہ منظر دیکھ کر عدیل کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی "ایک بات" یاد آگئی۔ وہ مرغیوں اور چوزوں پر خوب غور و خوض کرنے لگا۔ وہ وہاں کھڑا کافی دیر سوچتا رہا کہ یہ چوزے تو انسانوں سے اچھے ہیں۔ مرغیوں نے ایک دفعہ ہی انہیں بلایا تو وہ فوراً ان کا کہنا مان کر ان کے ساتھ چل دیئے۔ میری ماں تو مجھے 8 سال سے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہے۔ میں تو کبھی اپنی ماں کا کہنا نہیں مانتا۔ جب میں کھیل میں مصروف ہوتا ہوں تو میری ماں مجھے پیار سے کئی مرتبہ بلاتی ہے اور پھر ڈانٹ کر بھی کہتی ہے۔ میں ہر دفعہ یہی کہتا ہوں "اچھا اماں کھیل کر آجاتا ہوں"۔

واقعی کائنات میں موجود چیزوں پر غور و خوض کرنے سے کوئی نہ کوئی اچھا سبق ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ عدیل نے یہ سوچا اور اپنے دل میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوا اور چوزوں کے بارے میں سوچتا ہوا کھیت کی پگ ڈنڈی پر چل پڑا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ پیچھے سے اس کے بہن بھائی بھی آگئے۔ اب تیز آندھی بھی چلنے لگی تھی۔

"اتنی تیز آندھی ہے' بہتر ہے کہ ہم کھیتوں میں جانے کے بجائے گھر واپس چلے جائیں۔ لیکن عدیل یہ بات نہیں مانے گا۔ وہ بے شک آندھی میں اڑ جائے لیکن کھیتوں تک پہنچنے کی ضد ضرور پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔ عدیل کے کانوں میں اس کی بہن کی آواز پڑی۔ مگر عدیل نے فوراً کہا۔ نہیں باجی میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا چلو گھر چلتے ہیں۔ آندھی بہت تیز ہے۔ امی گھر میں پریشان ہو رہی ہوں گی"۔

عدیل میں یہ تبدیلی دیکھ کر راحیلہ بہت خوش ہوئی۔

وہ جلدی جلدی گھر واپس چلے گئے۔ ان کی امی واقعی بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے بچوں کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ جلدی اور خیریت سے واپس آگئے ہیں۔ عدیل کی والدہ نے آج شلجم گوشت پکائے ہوئے تھے اور وہ دل ہی

دل میں سوچ رہی تھیں کہ شلجم گوشت عدیل نہیں کھائے گا۔ وہ نبیل کو کہنے لگیں "نبیل یہ آندھی ذرا تھم جاتی ہے تو بازار سے آلو لے آنا۔ میں عدیل کو آلو بھون کر دوں گی کیوں کہ وہ شلجم اور گوشت نہیں کھاتا"۔

عدیل فوراً بولا "امی جان میں جو پکا ہے وہ ہی کھا لوں گا"۔

اس کی امی بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں "جیتے رہو بیٹا اچھا ہی ہے اگر اللہ تمہیں ہدایت دے دے"۔

اتنے میں کافی رات ہو گئی۔ کھانا کھانے کے بعد عدیل کو ہوم ورک یاد آیا۔ کیوں کہ دن کے وقت وہ اس امید پر کھیلتا رہا تھا کہ رات کو ہوم ورک کر لے گا۔ اب تیز آندھی کی وجہ سے لائٹ جا چکی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا کہ ہوم ورک کیسے کرے۔ وہ حسب معمول روتا ہوا امی کے پاس باورچی خانے میں گیا۔ "امی جان' اب اندھیرا ہے۔ میں ہوم ورک کیسے کروں؟"

"بیٹا عدیل' روتے کیوں ہو؟ کل ہی آپ کے ابو ایک بڑی سی موم بتی لائے تھے۔ وہ جلا لو اور ہوم ورک کر لو"۔

اب عدیل نے علیحدہ ایک کمرے میں بیٹھ کر موم بتی جلا کر ہوم ورک کرنا شروع کر دیا۔ وہ پڑھائی میں محو تھا۔ اسے اردگرد کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب کام ختم ہوا تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آندھی بھی اب تھم چکی تھی۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ موم بتی کو پھونک مار کر لحاف میں منہ دے اور گہری نیند سو جائے۔ مگر پھر جب اس نے موم بتی کو دیکھا کہ وہ پگھل پگھل کر آدھی بھی نہیں رہ گئی تو وہ اسے کچھ دیر اور دیکھتا رہا۔ موم پگھل پگھل کر آنسوؤں کے قطروں کی مانند نیچے گر رہی تھی۔ عدیل کے دل میں کام یابی کے راز کو پا لینے کا جذبہ تھا اور وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی "ایک بات" کے مطابق موم بتی پر خوب غور و خوص کر کے اس سے کام یابی کے لیے کوئی سبق حاصل کرنا چاہتا تھا۔ موم پگھل کر قطروں کی صورت میں نیچے گرتی رہی۔ اس طرح موم بتی چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ موم بتی قطرہ قطرہ موم کے گرنے سے کتنی چھوٹی رہ گئی ہے۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ اب میں کبھی نہیں روؤں گا۔ کیوں کہ اس طرح تو میں بھی موم کی طرح

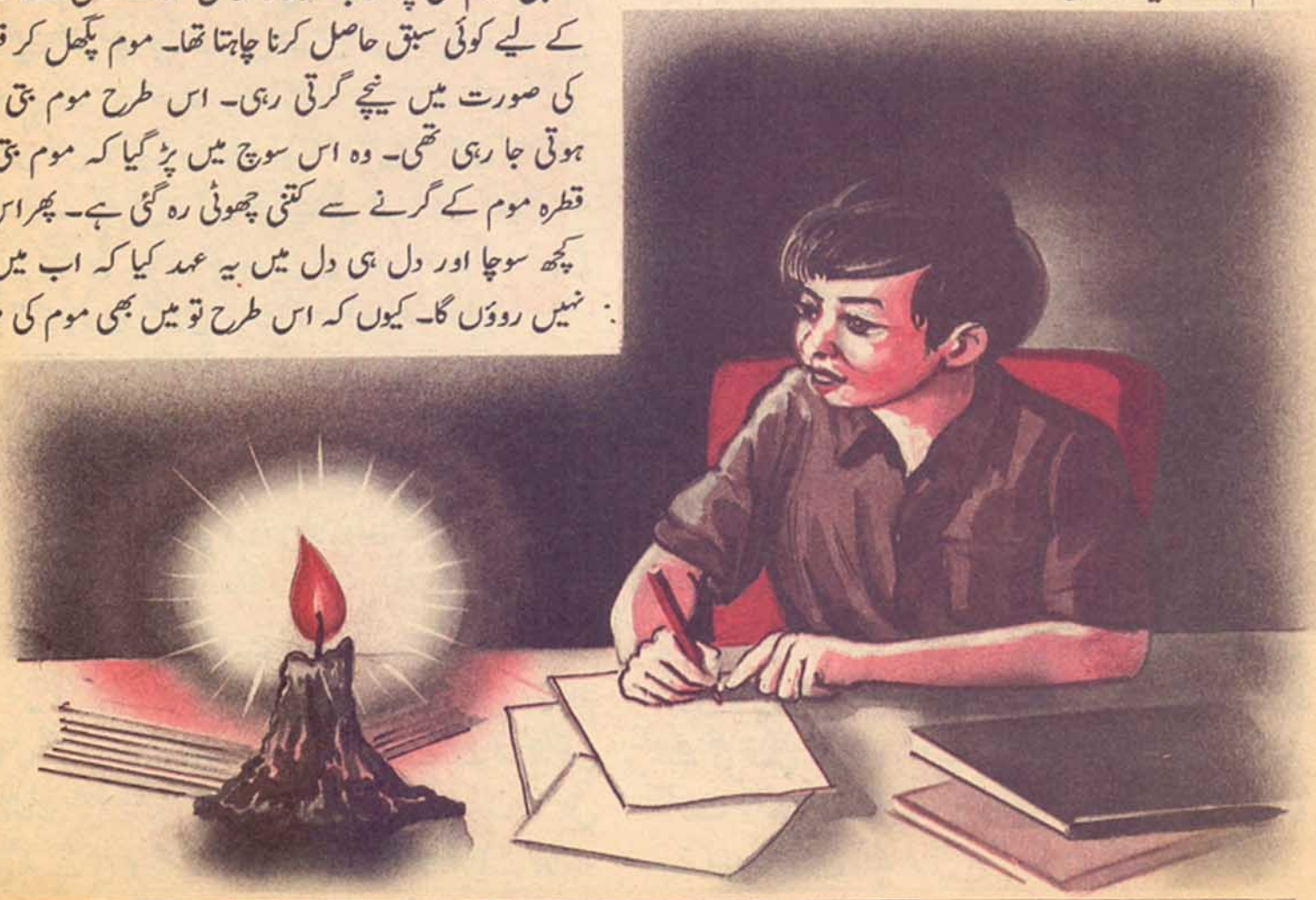

آنسوؤں کے گرنے کی وجہ سے چھوٹا رہ جاؤں گا۔ اب عدیل نے سچے دل سے عہد کرلیا کہ وہ کبھی نہیں روئے گا۔

اب تو عدیل میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ صبح صبح اٹھا اور اپنی امی کی مدد کے بغیر خود ہی اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ دانت صاف کئے۔ کپڑے بدلے اور سب سے پہلے ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ یہ تبدیلی دیکھ کر اس کی امی حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔

اسکول سے واپسی پر بھی عدیل نے آج کوئی ضد نہ کی اور نہ ہی رویا۔ جو ماں نے کپڑے استری کئے تھے وہی پہن لیے اور جو دیا وہ کھا لیا۔ اس کی امی بہت حیران تھیں کہ عدیل میں اتنی تبدیلی کیسے آئی؟ لیکن وہ عدیل کی ضد اور چڑچڑے پن سے بہت خوف زدہ تھیں۔ اس لئے وہ یہ بات عدیل سے نہیں پوچھ رہی تھیں۔

اب عدیل خود ہی بستہ پکڑ کر ہوم ورک کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب کہ وہ اس وقت تک تو دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھی چلا جاتا اور کئی ضدیں بھی کر چکا ہوتا۔ اس کی امی حیرت سے اسے ہوم ورک کرتے دیکھ رہی تھیں۔ اتنے میں اس کا ایک دوست آیا۔ "عدیل ہم آپ کا انتظار کرتے تھک گئے ہیں۔ آج تم کھیلنے گلی میں نہیں آئے"۔

پھر اس نے خود ہی عدیل کی کتابوں کو بند کرنا شروع کر دیا "آؤ یار چلو کھیلیں، رات کو ہوم ورک کر لینا۔

"نہیں یار، ٹھہرو میں نہیں کھیلوں گا"۔

"کیوں کیا بات ہے۔ عدیل؟"

میں پہلے ہوم ورک کروں گا پھر امی جان کے چھوٹے موٹے کام کروں گا۔ اس کے بعد تھوڑا بہت کھیلوں گا"۔

"واہ یار، کیا ہو گیا ہے آپ کو"

عدیل بولا "آؤ بتاؤں کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میں نے کام یابی کا راز پا لیا ہے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا تھا ناں کہ کائنات کی چیزوں پر غور و خوص کر کے ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کیا کرو۔ اس طرح تم کام یاب ہو جاؤ گے۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ "کل میں جب کھیتوں میں جا رہا تھا تو میں نے مرغیوں اور ان کے چوزوں کو دیکھا۔ مرغیاں دانہ دنکا چگنے میں مصروف تھیں جب کہ ان کے بچے کھیل کود رہے تھے۔ جونہی مرغیوں نے دیکھا کہ آندھی آنے والی ہے اور رات پڑ رہی ہے۔ انہوں نے ایک طرف کھڑے ہو کر کٹ کٹ کیا۔ سب بچے اپنی اپنی ماں کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ دیکھو یار، وہ ننھے منے معصوم سے مرغی کے بچے اپنی ماں کی ایک آواز پر اکٹھے ہو گئے اور سب کھیل کود چھوڑ کر اس کے ساتھ گھر چل دیئے۔ ہم انسان کے بچے ہیں۔ ہماری ماؤں کو ایک عرصہ گزر گیا ہے، ہمیں سمجھاتے ہوئے لیکن ہم اپنی ماں کا کبھی کہنا نہیں مانتے۔ اب میں تو ماں کا کہنا مانوں گا۔ اپنی مرضی نہیں کروں گا وہی کام کروں گا جو میری امی جان کہیں گی۔ اور نہ ہی اب میں رویا کروں گا۔ کیوں کہ رونے سے انسان چھوٹا رہ جاتا ہے۔ یہ بھی میری امی کہتی ہیں کہ جو بچہ روتا رہتا ہے وہ چھوٹا رہ جاتا ہے اور میں نے خود بھی تجربہ کیا ہے۔ رات کو موم بتی جل رہی تھی تو آنسوؤں کی طرح اس کی موم پگھل پگھل کر نیچے گر رہی تھی۔ اور موم بتی آہستہ آہستہ چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس پر غور و خوض کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسی طرح آنسو گر گر کر میں بھی چھوٹا رہ جاؤں گا"۔

"عدیل آپ کی بات تو بالکل صحیح ہے۔ میں بھی اب گھر جاتا ہوں اور کام یابی حاصل کرنے کے لیے کائنات کی چیزوں پر غور و خوض کر کے ان سے سبق تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ عدیل کے دوست نے کہا۔ یہ سب کچھ عدیل کی امی کچھ فاصلے پر کھڑی سن رہی تھیں۔ وہ تیزی سے دونوں بچوں کے پاس آئیں اور گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ "بچو، تم کتنے اچھے ہو۔ کتنی جلدی تم میں اتنی اچھی تبدیلی آگئی۔ فقط "ایک بات" سے۔ اللہ آپ کو مزید اچھا بننے کی توفیق دے اور آپ کے ہیڈ ماسٹر کے رتبے کو بلند کرے جنہوں نے ہمارے بیٹوں کو کام یابی کا راز بتایا"۔ امی نے کہا اور دونوں بچے خوش ہو کر چل دیئے۔

ٹارزن

سائنس فکشن / جدید ترین تحقیق

حسن ذکی کاظمی

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ننھا ٹونی اسٹیج پر کھڑا تھا اور ہاتھ کے اشاروں سے اور سر جھکا جھکا کر لوگوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ لوگ بڑی دیر تک تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ٹونی اسٹیج سے گلے میں سونے کا تمغہ لٹکائے نیچے اترا تو ماں اور باپ نے اسے باری باری گود میں اٹھا کر خوب چوما۔ اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں نے اسے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"یہ تبدیلی اس میں کیسے آئی؟ کیا اس کا کوئی خاص علاج ہوا ہے؟ کیا اسے کسی نے کوئی خاص دوا یا غذا کھلائی ہے؟ یہ تبدیلی اس میں اچانک آئی یا رفتہ رفتہ؟" اخباری نمائندے سوال کرتے رہے اور ٹونی جواب میں بس مسکراتا رہا۔ اسے خود کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ اسے تو اس کے والدین اور بھائی بہنوں سے بس اتنا پتا چلا تھا کہ وہ پیدا ہوا تو ذہنی طور پر معذور تھا۔ تقریباً پانچ سال کی عمر میں اچانک اس کی ذہنی معذوری ختم ہو گئی اور پھر یہ ہوا کہ ٹونی ذہانت میں اپنی عمر کے بچوں سے کہیں آگے نکل گیا۔ اس نے اسکول میں کارکردگی کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیئے۔ اسکول والے سخت پریشان اور حیران تھے کہ اسے اسکول کی کس کلاس میں رکھیں۔ اسکول والوں کا اندازہ تھا کہ اس کی قابلیت کا مقابلہ شاید کالج اور یونی ورسٹی میں بھی کم ہی لوگ کر سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ٹونی کو سونے کے تمغے اور دعاؤں کے ساتھ اسکول سے رخصت کر دیا کہ اب وہ جانے اور یونی ورسٹی والے جانیں۔

اخباری نمائندے بہت دنوں تک ٹونی کے گھر کے چکر لگاتے رہے لیکن انہیں ٹونی کی مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ ٹونی کی اچانک ذہانت سب کے لیے معمہ بنی رہی۔ اس کا حافظہ اتنا اچھا ہو گیا کہ وہ ایک بار چیز پڑھ لیتا تو اسے یاد ہو جاتی۔ جو بات اس کے سامنے کی جاتی وہ اس کے دماغ میں بیٹھ جاتی اور پھر کبھی نہ نکلتی۔ یوں تو وہ ریاضی اور سائنس کی بڑی مشکل گتھیاں منٹوں میں سلجھا دیتا اور تاریخ، جغرافیہ اور ادب کے بارے میں بھی خوب باتیں کرتا لیکن اسے سب سے زیادہ دل چسپی سیاست سے تھی۔ ٹونی کو نہ صرف اپنے ملک فلاور لینڈ کی سیاست میں دخل تھا بلکہ وہ جلد ہی دنیا کی سیاست کا ماہر مانا جانے لگا تھا۔

دنیا کے کسی ملک یا کسی حصہ میں کوئی بڑا سیاسی واقعہ ہوتا تو ریڈیو، ٹی وی اور اخبار والے ٹونی کی طرف دوڑ پڑتے اور اس کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ ٹونی پکا سیاست دان بن گیا اور اس کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس کی شہرت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی حیرت بھی بڑھتی جا رہی تھی کہ ایک بچہ کس طرح یہ کمال حاصل کر سکتا ہے۔ پھر ٹونی نے سیاسی پیش گوئیوں سے لوگوں کو حیران کرنا شروع کیا۔

فلاں ملک میں الیکشن کا کیا نتیجہ ہو گا؟ فلاں جگہ جو جنگ ہو رہی ہے اس کا فیصلہ کس طرح ہو گا؟ کون لیڈر آگے جائے گا اور کون پیچھے رہ جائے گا؟ کون سا ملک کس ملک کا ساتھ دے گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ وغیرہ وغیرہ

عجب اتفاق تھا کہ اس کی ساری پیش گوئیاں ہی ٹھیک ثابت ہو رہی تھیں۔

کچھ دن اور گزرے اور ٹونی کی قابلیت بڑھتی رہی۔ لیکن اب فلاور لینڈ کے لوگوں نے عجیب عجیب باتیں شروع کر دیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ٹونی پر آسیب کا اثر ہو گیا ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ سائنس دانوں نے اس کی ذہنی معذوری دور کرنے کے لیے اس کے دماغ میں کوئی مشین لگائی ہے جس نے اسے اتنا ذہین بنا دیا ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کا خیال کچھ اور ہی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ 1997ء میں سائنس دانوں نے جو پیش گوئی کی تھی کہ 2025ء تک ہماری دنیا کا دوسرے سیاروں سے رابطہ ہو جائے گا وہ پوری ہو گئی ہے اور ٹونی کسی اور سیارہ کی مخلوق ہے۔ یہ بات بڑی تیزی سے سارے شہر، سارے ملک اور دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ ٹونی اور اس کے والدین کو اخباری نمایندوں اور دوسرے لوگوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ہر وقت ان کے گھر کے باہر ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ٹونی بے چارا تو گھر میں قید ہو ہی گیا تھا لیکن اس کے والدین کے لیے بھی گھر سے نکلنا ناممکن ہو گیا۔ آخر تنگ آکر انہیں پولیس سے مدد مانگنا پڑی۔ وہ کہیں باہر جاتے تو پولیس کی حفاظت میں جاتے تھے۔

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ جو لوگ اپنے کو ٹونی کا ماں باپ بتاتے ہیں وہ اصل میں اس کے والدین نہیں ہیں۔ انہیں یہ راز معلوم ہے کہ ٹونی کون ہے اور کہاں سے آیا ہے لیکن وہ اس راز کو کسی وجہ سے چھپائے ہوئے ہیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ ٹونی کے کان لمبے ہیں۔ اور اس کی آنکھیں بھی ذرا سی ترچھی ہیں۔ کسی کو ٹونی کی ہنسی انسانوں سے مختلف نظر آتی تھی تو کسی کو اس کی آواز عجیب لگتی تھی۔ کسی نے یہ شوشہ بھی چھوڑا کہ جب اسکول میں ماں باپ نے ٹونی کو گود میں اٹھایا اور چمٹایا تو وہ ان سے پیچھا چھڑانے اور دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ ان کی اولاد ہوتا تو خود بھی ان سے لپٹتا چمٹتا۔ یہ بات بھی کہی گئی کہ ٹونی کسی کے سامنے کچھ کھاتا پیتا نہیں۔ اگر اس دنیا کی مخلوق ہوتا تو ہماری طرح کھاتا پیتا۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

بہرحال ایک بات یقیناً حیرت کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ ایک ایسا بچہ جو ذہنی طور پر پسماندہ ہو ایک دم اس قدر ذہین کیسے ہو گیا کہ اس نے اتنی سی عمر میں بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ بات ایسی پھیلی کہ اب لوگ ٹونی سے خوف کھانے لگے۔ خصوصاً پڑوسی تو کچھ زیادہ ہی ڈر گئے۔ وہ سوچتے تھے کہ دوسری دنیا کی مخلوق کا کیا بھروسا؟ کیا معلوم کیا کر بیٹھے۔ اور تو اور خود ٹونی کے بھائی بہن بھی اس سے ڈرنے لگے۔ نہ وہ کسی کے ساتھ کھیل سکتا تھا نہ باتیں کر سکتا تھا۔ رہے ماں باپ، تو ان سے وہ خود ناراض ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ساری تکلیفوں اور اس کے اکیلے پن کے ذمہ دار اس کے والدین ہیں۔ کیوں کہ وہ یہ راز نہیں بتاتے۔ وہ جب ان سے پوچھتا تو وہ اسے تسلی دے دیتے اور کہتے "بہت جلدی ساری بات کا پتا چل جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ ایسی ہی مجبوری ہے جو ابھی ہم یہ راز نہیں بتا سکتے"۔

پھر ٹونی کی ماں اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر اسے چمٹا لیتی اور باپ بھی پیار کرنے لگتا۔ ٹونی کو اکثر اخباری نمائندے ٹیلی فون بھی کرتے رہتے اور اس سے دریافت کرتے کہ حقیقت کیا ہے۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو وڈیو اسکرین پر وہی شکل نظر آئی جو کئی دن سے اسے تنگ کر رہی تھی۔ اس نے سوال کیا "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے اجنبی مخلوق؟ ہم لوگ تمہارے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم سکون سے رہنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتانا ہو گا"۔

ٹونی اس شخص کو پہچانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ فلاور لینڈ ٹائمز کا اڈیٹر ہے۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد

جواب دیا "ہاں میں نے کئی دن تک اپنے دماغ پر زور ڈالا۔ مجھے پچھلی باتیں یاد آنا شروع ہو گئی ہیں۔ ایک دو دن میں پوری بات بتا دوں گا"۔

اڈیٹر خوشی اور جوش سے اچھل پڑا اور بولا "اجنبی مخلوق، کیا تم واقعی سچ کہ رہے ہو؟ اچھا بتاؤ ہم دو دن بعد یعنی 12 اپریل کو تمہارا انٹرویو کر لیں؟"

ٹونی نے کتاب کے ورق پلٹتے ہوئے کہا "نہیں انٹرویو نہیں، میں پریس کانفرنس میں بات کروں گا۔ آپ 12 اپریل کو صبح 10 بجے پریس کانفرنس رکھ لیں، ٹاؤن ہال میں۔ میں اپنے والدین کے ساتھ پہنچ جاؤں گا"۔ یہ کہ کر ٹونی نے فون بند کر دیا اور آنکھیں بند کر کے صوفے پر آرام کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اخباری نمائندوں اور دوسرے لوگوں کو کسی طرح مطمئن کر دے تاکہ وہ خود بھی سکون سے رہ سکے۔

پریس کانفرنس کا دن آیا تو ٹاؤن ہال کے اندر اور باہر زبردست ہجوم تھا۔ پولیس کے لیے ٹریفک کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہال کے باہر بھی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ باہر بڑے بڑے ٹی وی اسکرین لگے ہوئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پریس کانفرنس دیکھ سکیں۔ ٹونی اپنے والدین کے ساتھ بڑی خاموشی سے ٹاؤن ہال پہنچا۔ لوگوں کو اس کے آنے کا پتا اس وقت چلا جب وہ گارڈ کی حفاظت میں پچھلے دروازہ سے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھا تو لوگوں میں بے انتہا جوش اور بے تابی پیدا ہو گئی۔ ہر شخص دوسرے سیارے کی اس مخلوق کو دیکھنے اور سننے کے لیے بے تاب تھا۔

پریس کانفرنس میں صرف ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخباروں کے نمایندے ہی شریک نہیں تھے بلکہ اور بہت سے مشہور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ مشہور سیاست دان روفی پریسٹن اور مشہور دماغی سرجن فرگوسن بھی آگے کی نشستوں پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔

ٹونی کے والدین اس کی ضد کی وجہ سے اسے پریس کانفرنس کے لیے ٹاؤن ہال لے تو آئے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہے گا کیا۔ انہوں نے ٹونی سے بہت پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اس نے ادھر ادھر کی بات کر کے انہیں ٹال دیا۔ کانفرنس میں اعلان ہوا کہ اب ٹونی بیکر اخباری نمائندوں کے سامنے بیان دیں گے تو ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ ٹونی نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور بولنا شروع کیا "جو لوگ خلائی تحقیق سے تعلق یا دل چسپی رکھتے ہیں انہیں یہ بات یقیناً معلوم ہو گی کہ بیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں جو خلائی مشن مریخ اور دوسرے سیاروں کی طرف بھیجے گئے تھے ان میں اس دنیا کے مردوں اور عورتوں کی تصویریں، شعبہ پیغامات کی ریکارڈنگ، اس دنیا کے نقشے، تصویریں اور دوسری معلومات بھی ساتھ روانہ کی گئی تھیں۔ اس سارے مواد کو خلا میں مختلف جگہ بکھیر دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مریخ یا دوسرے سیاروں میں اگر انسان کی طرح کی کوئی مخلوق آباد ہے تو یہ ساری چیزیں ضرور اس کے ہاتھ لگیں گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان چیزوں سے اس دنیا کے بارے میں کچھ جان لیں۔ سائنس دانوں کو امید تھی کہ اگر وہ یہ تصویریں، نقشے اور ریکارڈنگ دوسرے سیاروں کی مخلوق تک پہنچانے میں کام یاب ہو گئے تو پھر ان سیاروں کی مخلوق یقیناً اس دنیا تک پہنچنے کی کوشش کرے گی اور پھر اس دنیا کے لوگوں اور دوسرے سیاروں کے لوگوں میں رابطہ قائم ہو جائے گا"۔

ہال میں سناٹا تھا۔ ایسی خاموشی کہ سوئی بھی گرے تو اس کی آواز سنی جا سکے۔ لوگ سب کچھ بھول کر ٹونی کو تکے جا رہے تھے اور وہ بولے جا رہا تھا۔ "چاند سے نزدیک ترین سیارہ امینو ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا سیارہ ہے جس کی طرف اس دنیا والوں نے توجہ نہیں دی یا پھر بہت کم توجہ دی۔ اس سیارہ میں جو حالات پائے جاتے ہیں وہ زمین سے کافی ملتے جلتے ہیں۔ یہ تصویریں اور دوسری چیزیں جو خلا میں بکھیری گئی تھیں ان میں سے کچھ اس سیارہ تک پہنچ گئیں اور وہاں کے سائنس دانوں نے کافی عرصہ تک ان کا جائزہ

لیا اور آخر وہ زمین تک یعنی اس دنیا تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ چند سال تک امینو کے لوگ اڑن طشتریوں کے ذریعے اس دنیا میں آتے رہے۔ وہ چھپ چھپا کر آتے تھے اور جب اس دنیا والوں کی نظر ان پر پڑتی تو بھاگ جاتے تھے۔ امینو سیارہ والے یہاں سے ایسی چیزیں بھی لے گئے جن کے ذریعے انہوں نے اس دنیا کی چند بڑی بڑی زبانیں بھی سیکھیں اور پھر انہوں نے اپنے تین لوگوں کو اس دنیا کے مختلف حصوں میں بھیج دیا تاکہ یہاں کا پورا حال معلوم کر سکیں۔

یہ کہ کر ٹونی خاموش ہو گیا اور ہال میں بیٹھے اور کھڑے لوگوں کی بے تابی اور بڑھ گئی۔ انہوں نے مختلف سوال شروع کر دیئے۔ لیکن ٹونی نے وہ سوال جیسے سنے ہی نہیں اور پھر بولا "اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں.... میرا مطلب ہے کہ آپ حیران ہوں گے یعنی آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ ان تین لوگوں میں جو امینو سیارہ سے اس دنیا میں آئے تھے میں بھی شامل ہوں"۔

ہال میں شور مچ گیا۔ لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ پولیس نے بڑی مشکل سے مجمع کو قابو کیا اور اسٹیج تک پہنچنے سے روکا۔ البتہ سیاست دان پریسٹن اور سرجن فرگوسن کسی نہ کسی طرح اسٹیج پر پہنچ گئے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا جوش اور حیرت کچھ خوف کی کیفیت میں بدلنے لگے۔ لوگ دوسری دنیا کی مخلوق کو اس قدر قریب اور اپنے درمیان دیکھ کر ڈر محسوس کر رہے تھے۔ شور بھی کافی کم ہو گیا تھا۔ اچانک سرجن فرگوسن کی آواز ہال میں گونجی۔ وہ کہ رہے تھے۔ "یہ باتیں تو آپ نے سن لیں۔ اب میری بات بھی سن لیجئے"

لیکن لوگ ان کی بات سننے کو بالکل تیار نہ تھے۔ انہوں نے شور مچا دیا "ہم اجنبی مخلوق کی باتیں سننے آئے ہیں۔ اسے بولنے دیجئے۔ آپ اسٹیج سے نیچے آجائیں۔ ٹونی کو اپنے بارے میں بتانے دیں"۔

سرجن فرگوسن نے بڑی مشکل سے مجمع کو خاموش کیا اور بولے "میری بات تو سنیں۔ میں ایک حیرت انگیز بات بتانا چاہتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز جو ابھی آپ نے ٹونی سے سنی۔ میں پریسٹن اور ٹونی ایک ہی کہانی کے تین کردار ہیں"۔

ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سرجن فرگوسن نے موقعہ پاتے ہی بولنا شروع کیا "میں بڑی مختصر بات کروں گا اور آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ لوگوں کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ اکیسویں صدی کا چوتھائی حصہ گزرنے کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ تجربہ گاہوں میں انسانی خلیوں سے پورے پورے اعضا تیار کر لیں۔ صحت مند انسان کے دماغی خلیوں سے معذور لوگوں کے دماغ کی مرمت یا علاج کا تجربہ بھی کامیابی سے کیا جا چکا ہے۔ میں نے اور میرے ساتھی سائنس دانوں نے اب یہ تجربہ کرنا چاہا کہ صحت مند انسان کے دماغی خلیوں کو اس طرح معذور انسان کے دماغ میں پیوست کیا جائے کہ اگر ساری نہیں تو اس کی کچھ ذہانت اور صلاحیت ان خلیوں کے ذریعے ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں منتقل ہو جائے۔ چناں چہ مسٹر پریسٹن جو ملک کے مشہور وکیل اور سیاست دان ہیں' اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ ان کے دماغ کے کچھ خلیئے جن کا تعلق ذہانت سے ہے' نکال کر کسی ذہنی معذور کے دماغ میں پیوست کر دیئے جائیں۔ ہم نے مسٹر پریسٹن کے دماغ سے نکالے ہوئے خلیوں کو پہلے اپنی تجربہ گاہ میں اس قابل بنایا کہ دوسرا دماغ انہیں قبول کر لے اور ان کی صلاحیت کو اور ابھارا۔ اس کے بعد یہ خلیئے ایک ذہنی معذور بچے کے دماغ میں لگا دیئے گئے۔ ہم نے جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی اور ہماری کامیابی کا ثبوت آپ کے سامنے ہے"۔

"جی ہاں! یقین جانیے ٹونی اسی دنیا کا رہنے والا ہے۔ اس کا کسی اور دنیا سے تعلق نہیں۔ اس کی ذہانت دراصل مسٹر پریسٹن کی ذہانت ہے لیکن اس کی ذہانت مسٹر پریسٹن سے بھی زیادہ ہو گئی کیوں کہ جو خلیئے ان کے دماغ کے ذہانت والے حصہ سے لیے گئے تھے انہیں تجربہ گاہ میں بہتر

بنا کر ٹونی کے دماغ میں لگایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کم عمری میں بھی اس قدر ذہین ہے۔ ویسے تو مسٹر پریسٹن اور میرے ساتھی سائنس دان میری باتوں کی تصدیق کریں گے اور تجربہ گاہ کے ریکارڈ سے بھی ثابت ہو گا کہ میری بات یہ ہے لیکن ایک خاص بات اور اپنے ثبوت کے لیے میں آپ کو بتاتا ہوں۔

وہ یہ کہ تین چار بڑے بڑے سیاسی واقعات کے بارے میں مسٹر پریسٹن اور ٹونی نے جو رائے دی وہ بالکل ایک جیسی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کہ خلیوں کی وجہ سے ان دونوں کی سوچ ایک ہے"۔

اپنی بات ثابت کرنے کے لیے سرجن فرگوسن نے دونوں کے وہ بیانات پڑھ کر سنائے جو وہ ساتھ لائے تھے۔ سرجن خاموش ہوئے تو حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا "تو پھر ٹونی نے یہ ی کیوں جا ا؟"

ابھی سرجن کچھ جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ ٹونی بول اٹھا "اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ میں صحت مند ہونے سے کی کی زندگی کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے کچھ باتیں ط لی ط لی یاد آتی بھی تھیں تو بالکل عجیب سی۔ جن سے میں اور الجھ جاتا تھا۔ پھر لوگوں نے میرے بارے میں نئی نئی باتیں کہنا شروع کیں تو میں اور الجھ گیا۔ مجھے خود بھی یقین ہونے لگا کہ میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ میرے والدین بھی کچھ نہیں بتاتے تھے۔ لہٰذا میں نے یہ ی جا ا۔ مجھے یقین تھا کہ میں پریس کانفرنس میں یہ بات کروں گا تو میرے والدین یا کوئی اور اس راز پر سے ضرور پردہ اٹھائے گا اور اس طرح مجھے اس الجھن اور پریشانی سے نجات ملے گی"۔

سرجن فرگوسن بیچ میں بول اٹھے "یہ منصوبہ بھی اس بچہ کی ذہانت کا ثبوت ہے۔ رہی یہ بات کہ ہمارے تجربہ کو راز میں کیوں رکھا گیا تو ٹونی کو اپنے والدین سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک اخلاقی معاہدہ تھا کہ جب تک ہم اجازت نہ دیں وہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ ہم اس لیے اپنے اس تجربہ کی کام یابی کو راز میں رکھنا چاہتے تھے کہ اگر اس کا اعلان کیا جاتا تو نہ صرف ہمارے ملک بلکہ دنیا بھر سے لوگ دوڑ پڑتے اور ہمارے پاس ان کے علاج کا انتظام نہ ہوتا۔ ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اب ہماری تجربہ گاہ میں اتنا انتظام ہے کہ ہم کافی تعداد میں ذہنی نس ندہ بچوں کا علاج کر کس ہیں اور اس سلسلہ میں مسٹر روفی پریسٹن نے ہمیں بہت بڑی رقم دی ہے کیوں کہ....."

ٹونی نے سرجن کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کیوں کہ وہ اس سے اپنی سیاسی دکان داری چمکانا چاہتے ہیں اور لیڈر بننا چاہتے ہیں"۔

سرجن فرگوسن حیرت سے ٹونی کا منہ دیکھنے لگا اور پریسٹن نے غصہ سے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

ٹونی نے ہلکا سا قہقہ لگایا اور بولا "مسٹر پریسٹن میر بھولئے کہ میرے دماغ میں آپ کے دماغ کے خلیئے ہیں لہٰذا ہماری سوچ بھی ایک ہے۔ سا ایئے نہیں آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ کیوں سرجن فرگوسن آپ کا کیا خیال ہے؟"

سرجن حیرت سے منہ کھولے اسے تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا "کیا یہ میرے کام یاب تجربہ کا ایک نیا روپ ہے؟"

دل چسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

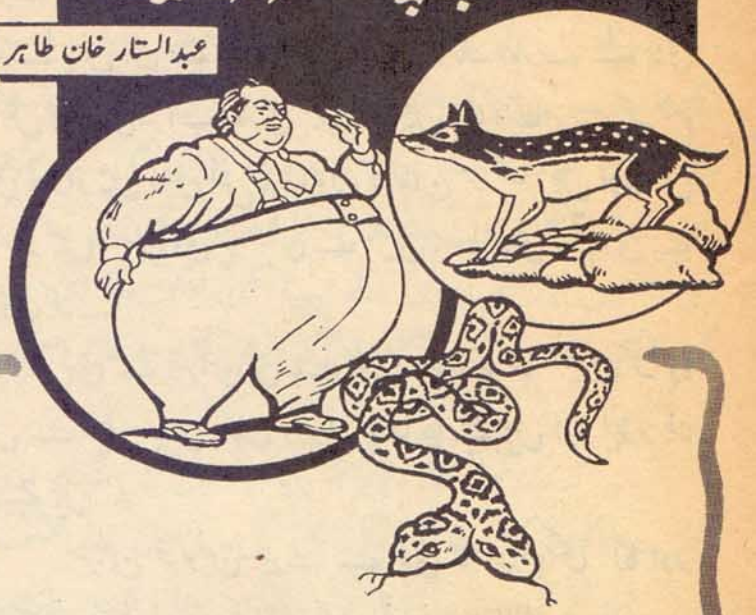

فریب دہی کا انوکھا واقعہ

سیلون میں اصل مجرم کی جگہ قید بھگتنے والے ایک اجرتی قیدی کا بھید کھل جانے سے فریب دہی کے ایک انوکھے کیس کا انکشاف ہو گیا۔ بات یوں ہوئی کہ ایک بااثر شخص کو ایک عدالت سے فریب دہی کے الزام میں تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی جس کے خلاف اس نے اپیل کی تو وہ مسترد ہو گئی۔ اس نے قید کی تکلیف سے بچنے کے لیے عدالت کے دو افسروں کے ساتھ ساز باز کر کے اپنی جگہ ایک کرائے کے آدمی کو جیل بھجوا دیا۔وہ کرائے کا آدمی بڑی کامیابی سے قید کاٹتا رہا لیکن اتفاق سے اس شخص کے خلاف ایک پرانا مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہوا تو پولیس نے اسے جیل سے طلب کیا۔ چناں چہ جب بااثر شخص کا نعم البدل جیل سے عدالت میں لایا گیا تو اصل بھید کھل گیا اور اصل مجرم، عدالت کے دونوں افسروں اور نقلی مجرم کو بھی فریب دہی میں دھر لیا گیا۔

آواز کی قسمیں

جس طرح وزن دو قسم کے ہوتے ہیں-ایک وہ جنہیں ہم اٹھا سکتے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں ہم نہیں اٹھا سکتے۔ بالکل اسی طرح آوازیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جنہیں ہم سن سکتے ہیں اور دوسری وہ جنہیں ہم نہیں سن سکتے۔ انسانی کانوں کی سماعت کی ایک حد ہے جس سے باہر کام کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ یہ حد کم از کم 18 ہرٹز سے لے کر زیادہ سے زیادہ 18000 ہرٹز تک ہوتی ہے۔ ہرٹز آواز کی اکائی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح گرام وزن کی اکائی ہے۔ ان مقداروں سے کم یا زیادہ آواز ہم نہیں سن سکتے۔ ایسی آوازوں کو جنہیں ہم نہیں سن سکتے "ماورائے سماعت آوازیں" کہتے ہیں۔ کائنات ماورائے سماعت آوازوں سے بھری پڑی ہے۔ زلزلے، آندھیاں، بجلی کی کڑک، پھٹتے ہوئے آتش فشاں کی گرج، بھڑکتی ہوئی آگ، ہل چل مچاتا ہوا پانی، یہ سب چیزیں بہت سی ماورائے سماعت آوازیں بھی پیدا کرتی ہیں۔ کچھ ہمارے کانوں کی حد سے زیادہ ہوتی ہیں اور کچھ حد سے کم ہوتی ہیں-اس لیے ہم انہیں نہیں سن سکتے۔

منصف جج

جیمز ہاکنز 14 سال تک امریکا میں فیڈرل کورٹ کا جج رہا۔ جیمز ہاکنز کا انصاف کے بارے میں اپنا ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں اس نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھی۔ وہ صبح گھر سے نکلنے سے پہلے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا-تاکہ ملزموں کے چہروں کو دیکھ کر متاثر نہ ہو سکے۔ عدالت میں جو کاغذات اس کے سامنے پیش کیے جاتے، ایک کلرک ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔

ایک سال

انقلاب سے پہلے کے چین میں ایک جنرل میدان جنگ میں مارا گیا تو اس کا جنازہ ایک سال تک حالت سفر میں رہا۔ یہ واقعہ جون 1912ء کا ہے۔ جنرل "ژی چون" کا جنازہ پیکنگ سے روانہ ہوا اور کاشغر سے ہوتا ہوا سنکیانگ پہنچایا گیا جہاں اسے دفن کرنا تھا۔ پیکنگ سے سنکیانگ تک دو ہزار تین سو میل کا فاصلہ ہے۔ سینکڑوں سپاہی اس جنازے کے ساتھ چلتے رہے اور ایک سال کی مدت میں جون 1913ء میں اپنی منزل پر پہنچے۔

محبِّ وطن خاتون

1922ء میں جب یونانی درندے ترکی پر چڑھائی کر رہے تھے۔ سمرنا پر ان کا قبضہ بھی ہو چکا تھا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت انونو کی زیر قیادت ترکوں نے وہ جنگ لڑی جس کی مثال تاریخ میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ اناطولیہ کے پہاڑوں پر زبردست برف باری بھی ہو رہی تھی اور یونانیوں کی گولا باری بھی۔ ایسی قیامت میں ایک دیہاتی ترک عورت ننگے پاؤں ترکی کے مورچوں کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اس عورت کے بائیں کندھے پر اس کا بچہ بالکل ننگا چمٹا ہوا تھا اور اس عورت کی دائیں بغل میں کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی اور وہ مسلسل دوڑ رہی تھی۔ بچے کو بھی سنبھالتی جاتی اور اس چیز کو بھی۔ جب اسے راستے میں روک کر پوچھا گیا کہ اس نے اپنے بچے کو کپڑوں میں کیوں نہیں لپیٹا حال آں کہ سخت سردی ہے اور یہ بغل میں کیا دبائے لیے جا رہی ہو؟ اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی چیز کھول کر دکھائی۔ یہ توپ کا ایک گولہ تھا۔ اس ترک عورت نے یہ گولہ بچے کے کپڑے اتار کر ان میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر آگے کی طرف بھاگی کہ اس وقت گولہ ایک نایاب چیز ہے جس کو میں اپنی ترک فوج کو دینے کے لیے جا رہی ہوں۔ یہ توپ کے گولے اس وقت ہمارے بچوں سے زیادہ قیمتی ہیں کیوں کہ یہ اس وقت ناپید ہیں۔ وہ سردی کی پروا کیے بغیر دوڑتی ہوئی مورچے میں جا پہنچی اور گولہ اپنی فوج کے حوالے کر دیا۔

بادشاہ کی شیو

سپین کا آخری بادشاہ الفانسو ہشتم اپنے ملک کے لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے مسائل جاننے کے لیے دورے پر نکلا۔ ایک انتہائی پس ماندہ قصبے کے ہوٹل میں اس نے کسی فرضی نام سے کمرا حاصل کیا۔ اگلی صبح جب اسے شیو کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہوٹل کے مالک سے آئینہ مانگا۔ مالک نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا "آپ عام مسافروں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ کے لباس اور اطوار سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق شاہی خاندان سے ہے" الفانسو نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی۔ ہوٹل کا مالک اپنے اندازے کی صحت سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا "آپ بادشاہ کے معاون ہیں نا؟"

الفانسو نے پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ "آپ بادشاہ کے لیے کیا کام کرتے ہیں؟" مالک نے ایک اور سوال کیا۔

"بہت سارے کام" الفانسو نے خوش دلی سے کہا "مثلاً جب تم آئینہ لے آؤ گے تو میں بادشاہ کی شیو بناؤں گا"۔

روایت اپنی اپنی

بابائے اردو مولوی عبدالحق ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے کہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے کسی مغرب زدہ شخص نے ان سے کہا "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

مولوی عبدالحق نے جواب دیا "جی ہاں! پوچھ سکتے ہیں"

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مولوی صاحب کے کسی عقیدت مند نے بعد میں ان سے دریافت کیا "مولوی صاحب! آخر آپ نے اپنا نام انہیں کیوں نہیں بتایا تھا؟"

مولوی صاحب فرمانے لگے "صاحب، گفت گو کا یہ کیا انداز ہوا۔ ہماری زبان میں اس طرح نہیں کہتے بل کہ یوں کہتے ہیں کہ آپ کا اسم شریف یا جناب کا نام؟ ان صاحب نے اپنی روایت کو سمجھے بغیر انگریزی کے اس جملے کا محض لفظی ترجمہ کر دیا "MAY I KNOW YOUR NAME?" اور جتنی بات انہوں نے پوچھی میں نے اس کا جواب دے دیا"۔

تیمور لنگ

تیمور لنگ نے 1370ء سے 1402ء تک 21 لاکھ 45 ہزار مربع میل رقبہ فتح کیا۔ تیمور کے معنی ہیں "فولاد"۔ جب تک امیر تیمور سیستان کی لڑائی میں پاؤں میں تیر لگنے کی وجہ سے لنگڑا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک تیمور ہی کہلاتا تھا۔ مگر اس کے بعد جو لوگ اس کی تحقیر کرنی چاہتے تھے وہ اسے تیمور لنگ یا تمر لنگ کہنے لگے۔ جب کہ مغربی صحافی اور مورخ اسے ٹیمر لین یا ٹمر لکھتے ہیں۔

اپاہجوں کے لیے گاڑی

کولونیہ کے انجنیر ہائنس وائزٹ نے معذوروں کی سہولت کے لیے "الیکٹرو موبائل" نامی ایک گاڑی ایجاد کی ہے۔ جسے ہر عمر کے معذور افراد آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ موجد کی اپنی بچی چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ اس بچی نے اپنے اسکول میں اس گاڑی کے استعمال کا مظاہرہ کیا۔ گاڑی کی آرام دہ کرسی کو بٹن دبا کر اونچا نیچا کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح بٹن دبا کر اسے چھوٹا بڑا بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بٹن ٹھوڑی کی مدد سے بھی دبائے جا سکتے ہیں۔ اس گاڑی کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس پر کسی دقت کے بغیر سڑکوں اور گلیوں میں بھی گھوم سکتے ہیں۔ اس کو چاروں طرف موڑنے کے لیے ایک چھوٹا سا ڈنڈا استعمال کیا گیا ہے۔

گندم کی چار فصلیں

ایک دفعہ پیرس میں بین الاقوامی زرعی ماہرین کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے روسی نمائندہ کہنے لگا "روس زرعی اعتبار سے جنت ارضی ہے کیوں کہ وہاں سال میں گندم کی چار فصلیں حاصل کی جاتی ہیں"۔

سب لوگ حیرت سے اس کو دیکھنے لگے پھر ایک شخص اٹھا اور اس نے روسی نمائندے سے پوچھا کہ ایسا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ روسی نمائندے نے بڑی نرمی سے جواب دیا "یہ تو بہت آسان ہے۔ ایک فصل ہم پولینڈ سے، ایک ہنگری سے، ایک چیکو سلاویکہ سے اور چوتھی خود روس سے حاصل کرتے ہیں"۔

شور جذب کرنے والی مشین

ہیم برگ کے طیارہ سازی کے کارخانے کے انجنیروں نے ایک مشین ایجاد کی ہے جو قرب و جوار کے شور کو جذب کر لیتی ہے۔ اس مشین کا نام "مفلر" ہے۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اسے جیٹ انجنوں کا شور جذب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مشین میں اوپر نیچے کئی پائپ لگائے گئے ہیں جو شور و غل کو اپنی طرف کھینچ کر

جذب کر لیتے ہیں۔ یوں طیارہ سازی کے اس کارخانے کے اردگرد بسنے والے لوگ جیٹ انجنوں کے شور سے محفوظ رہتے ہیں۔

عجیب و غریب ٹائپ مشین

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر برنس ویک کے انجنیر ایک ایسا ٹائپ رائٹر ایجاد کرنے میں مصروف ہیں جو ٹائپ کرنے والے کی زبان سے مضمون سن کر ٹائپ کر دیا کرے اور انگلیوں سے ٹائپ کرنے کا جھنجھٹ ختم ہو جائے۔ فی الحال ان کی کوششوں سے یہ مشین زبان سے سن کر ایک سے نو تک اعداد ٹائپ کر لیتی ہے۔

ابوریجن اور پیغام رسانی

افریقہ کے جنگلی لوگوں کو حبشی (نیگرو) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کے حبشی آسٹریلیا کے وسیع و عریض صحرا میں مادر زاد ننگے رہتے ہیں۔ انہیں ابو ریجن میں (ABORIGIN) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کئی کئی دن تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ ان کی خوراک چھپکلیاں، صحرائی چوہے، چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی ایک جگہ پر گھر بنا کر نہیں رہتے بلکہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ہم انہیں خانہ بدوش کہہ سکتے ہیں مگر اصل میں دیکھا جائے تو یہ اس اصطلاح پر بھی پورے نہیں اترتے کیوں کہ عام خانہ بدوشوں کی طرح یہ خیموں میں رہنے کے بجائے کھلے آسمان کے نیچے سوتے ہیں۔ زمین کا بستر اور آسمان کی چادر ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔

ان میں یہ قدرتی وصف ہے کہ میلوں دور سے بھی ایک دوسرے کا پیغام سن لیتے ہیں۔ ان کا کوئی فرد مر جائے تو ایک بزرگ بغیر بولے یہ پیغام نشر کرتا ہے۔ ان کے قریبی رشتے دار جو کئی میل دور ہوتے ہیں۔ فضا سے یہ پیغام سن لیتے ہیں۔ جیسے ہمارا ریڈیو ریڈیائی لہروں کو سن لیتا ہے جب کہ ہم انہیں ان کی اصل حالت میں سننے سے قاصر رہتے ہیں۔ پیغام سنتے ہی وہ تمام لوگ اس ماتم کناں خاندان کی طرف چل پڑتے ہیں۔ سائنس دانوں نے کمپیوٹر اور دیگر ذرائع کی مدد سے ان لوگوں کی تشخیص کی اور ان میں پائے جانے والے اس قدرتی وصف کی تصدیق کی ہے۔ لیکن وہ لوگ قدرت کے اس کرشمے کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ کوئی انسان ریڈیو یا وائرلیس کا کام کس طرح کر لیتا ہے؟ لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔

مصنوعی لکڑی

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ایک 30 سالہ کاری گر نے شب و روز کی محنت سے مصنوعی لکڑی ایجاد کی ہے۔ لکڑی کا یہ نعم البدل اسٹیج کی سیڑھیاں بنانے، استرکاری تختیاں بنانے کے لیے بہت موزوں ثابت ہو گا۔

قیصر

لفظ قیصر کے وجود میں آنے کی داستان یہ ہے کہ روم کے قدیم بادشاہوں میں سے ایک کا نام جولیس قیصر تھا۔ اس نے بہت نام کمایا تو یہ ایک روایت بن گئی کہ لفظ قیصر ہر رومی شہنشاہ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ چناں چہ یہ لفظ رومی شہنشاہوں کے ناموں کا لازمی حصہ بن گیا۔

آیئے دوست بنائیں

دائم عباس شمسی 10سال
کرکٹ کھیلنا
14 الیف زبیدہ پارک ملتان روڈ،
لاہور25

محمد اجمل اشرف 14سال
کرکٹ کھیلنا
کوارٹر نمبر5/4 کینال کالونی سرگودھا

شاہد منظور 13سال
مطالعہ کرنا
200/A سیٹلائیٹ ٹاؤن سرگودھا

فرقان لیاقت 10سال
رسالے پڑھنا
مین سٹریٹ نمبر2 خلیل آباد کالونی
دیپال پور، اوکاڑہ

محمد اویس یاسر 15سال
موٹر سائیکل چلانا
19/3 حفیظ روڈ معصوم گنج، لاہور

مصطفیٰ عارف 13سال
مچھلی کا شکار
مکان نمبر14 گلی نمبر5 بلاک Z،
سرگودھا

قمرالظفر محمد علی حسن 9سال
کرکٹ کھیلنا
مکان نمبر19 گلی نمبر3 بند روڈ لاہور

محمد طلحہ بن ضیاغوری 14سال
نادر چیزیں جمع کرنا
1480- A فیز1 گلشن حدید بن
قاسم، کراچی

محمد ارشد دستی 14سال
شاعری کرنا
مکان نمبر26 گلی نمبر1 بلاک نمبر
10، ڈیرہ غازی خان

محسن گلزار 14سال
کرکٹ کھیلنا
نیو لک شاپنگ سنٹر پیپلز کالونی لالہ
بھائی پلازہ، گوجرانوالہ

حسین فرخ 15سال
قلمی دوستی
مکان نمبر 13A/3 آفیسرز کالونی
ملتان

سہیل شہزاد 14سال
نماز پڑھنا
وارڈ نمبر3 نزد باب عمر گیٹ جھنگ

طاہر عزیز 14سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
ایم سی 1043 گرین ٹاؤن کراچی
نمبر43

دقاص بن خالد 13سال
کرکٹ کھیلنا
ہاؤس نمبر20- جی او آر- پی اے
الیف روڈ، سرگودھا

محسن بابر مغل 13سال
قلمی دوستی
مکان نمبر 19 گلی نمبر 40 کوٹ
خواجہ سعید لاہور

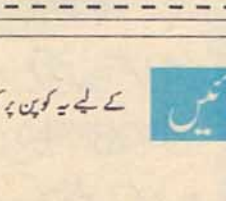

میر محمد عمران ادریس 13سال
مطالعہ کرنا
32 مقدس پارک گلشن راوی،
لاہور

ایم شہزاد علی 15سال
کرکٹ کھیلنا
شہباز پرنٹنگ پوائنٹ چوک فائر
برگیڈ، ریلوے روڈ شیخوپورہ

علی رضا 11سال
کہانیاں پڑھنا
محلہ اشرف دین رحیم یار خان

غلام دستگیر 10سال
کرکٹ کھیلنا
محلہ عیسیٰ لنگاہ، دیپال پور، اوکاڑہ

خرم شہزاد بشیر 14سال
پتنگ بازی
محلہ شہیداں سرائے عالم گیر، جہلم

نوید انجم وکی 9سال
تصویریں بنوانا
ڈاکٹر عبدالمجید انجم بلاک نمبر31
سمن آباد فیصل آباد

محسن رضا 9سال
بڑوں کا ادب کرنا
92 ریواز گارڈن، لاہور

آیئے دوست بنائیں

کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے

(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام ..... عُمر .....

مشاغل .....

پتا .....

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ایک مثالی مولانا

جہاں تک نظر جاتی سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ لوگ تقریر سننے کے لیے اُمڈے چلے آرہے تھے۔ لوگوں کی بے تابی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک لمبے قد کا آدمی جس کے چہرے پر نورانی ڈاڑھی تھی، تقریر کرنے کے لیے اسٹیج پر آیا۔ لیکن تقریر شروع کرنے سے پہلے اسے کہا گیا کہ مخالفوں نے آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس خبر سے اس کے چہرے کے تاثرات بدل جانے یقینی تھے۔ مگر اس کے برعکس وہ مطمئن رہا اور نہایت عزم کے ساتھ تقریر شروع کر دی اور زوردار الفاظ میں کہا "لوگو! اس سے بڑھ کر میری اور کوئی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں! جو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے وہ اپنا ارمان پورا کر لے"

اس کی اس شجاعت، دلیری، بے باکی اور بہادری کو دیکھ کر مخالفین ایسے خاموش ہوئے جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو اور کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ یہ اپنے وقت کے ایک مشہور مولوی صاحب تھے جن کی قائداعظمؒ بہت عزت کرتے تھے۔ جب 14 اگست 1947ء کو پاکستان بنا تو تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے سبھی سپاہی اور جرنیل قائداعظم کے سامنے صف بستہ تھے اور بلاشبہ وہ سبھی قابل احترام تھے لیکن پاکستان کا پرچم سب سے پہلے لہرانے کے لیے قائداعظم نے انہی مولانا صاحب کو منتخب فرمایا۔ اس طرح پاکستان کا سب سے پہلے پرچم لہرانے کا اعزاز انہیں کو حاصل ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔ یہ نومبر 1947ء کی بات ہے جب وہ جیکب لائن میں اے ایم قریشی کے ایک بوسیدہ سے بنگلے کے ایک کمرے میں بیمار پڑے تھے۔ پاکستان کے دیگر صاحب اقتدار تو بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے تھے مگر مولانا بیماری کی حالت میں بھی ایک بوسیدہ سے کمرے میں رہائش رکھے ہوئے تھے اور وہ بھی ان کا اپنا ذاتی نہیں تھا۔ مگر مولانا جیسے پاکستان کے حقیقی معماروں کی جانب توجہ کرنے کی کسی کو فرصت ہی نہ تھی اور نہ ہی کسی نے اس اہم فریضے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ کیوں کہ ان مفاد پرست لوگوں کا مطلب نکل چکا تھا۔

مولانا اس زمانے میں پاکستان سے کافی مایوس تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں کے صاحب اقتدار افراد نے اونچی کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور وہ تمام وعدے اور نظریات جن کو پورا کرنے کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا، اب ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ اس لیے مولانا پاکستان کے صاحب اقتدار لوگوں سے بہت مایوس تھے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام انہیں سراب نظر آنے لگا تھا۔ انہیں یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا خواب دکھا کر مسلمانوں سے دھوکہ اور فریب کیا گیا ہے۔ مولانا کو پاکستان کے صاحب اقتدار لوگوں کا بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔

مولانا ایک باعمل عالم تھے۔ انہوں نے جنگ بلقان میں ترکی کے ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کیا تھا۔ ہندوستان میں وہ تحریک خلافت کے پرزور مبلغ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو برطانوی ہند کی تحریک کی بنا پر شریف مکہ کی حکومت نے مکہ معظمہ میں گرفتار کر لیا۔ شریف مکہ حکومت برطانیہ کا آلہ کار تھا اور انگریزوں کے اشارے پر ناچتا تھا۔ شیخ الہند کو پانچ سال کے لیے مالٹا کے جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کے

دوران میں انہی مولانا نے رائے عامہ کو برطانوی حکومت کی اس حرکت کے خلاف بیدار کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا۔ ان کی موثر تقریروں نے حکومت کے خلاف مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔

تحریک پاکستان کے سلسلے میں ان مولانا کو اس لحاظ سے بہت بڑا مقام حاصل ہے کہ ان کی کوششوں اور مسلم لیگ میں شمولیت سے علما کا ایک جان دار گروہ اس تحریک کا ہم نوا بن گیا اور یوں پاکستان حاصل کرنے کی وہ منزل قریب تر آگئی جس کے لیے برصغیر کے مسلمان ایک عرصے سے جدوجہد کر رہے تھے۔

مسلم لیگ یقیناً ایک فعال اور بڑی جماعت تھی لیکن مولانا کی شمولیت سے پہلے یہ کمی ضرور محسوس کی جاتی تھی کہ اس کے اندر رباثر علما کا کوئی ایسا گروپ موجود نہیں جیسا کانگرس کے اندر جمعیت العلمائے ہند کا تھا۔ اس کمی کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ مسلم عوام میں مسلم لیگ کو مغرب زدہ اور انگریز پرست لوگوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ یہ مولانا مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو اغیار کا یہ نہایت موثر اور خطرناک پروپیگنڈہ بے اثر ہو کر رہ گیا اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جس جماعت میں ان مولانا جیسے جید عالم شامل ہو گئے ہیں وہ لازماً اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوشاں ہو گی۔

مولانا دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل بحیثیت استاد صدر الصدور اور کانگرس کی ہم نوا جمعیت العلمائے ہند میں شامل مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید وغیرہ جید علمائے کرام کی صف کے آدمی تھے اور ان کی اس حیثیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں سمیت مسلم لیگ میں آگئے تو گویا ہندو سیاست کے اس پروپیگنڈے کا جنازہ اٹھ گیا کہ پاکستان کا مطالبہ اس ملک کی آزادی کو کھٹائی میں ڈالنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔

اسی طرح مولانا کے تحریک پاکستان میں شامل ہونے سے ان لوگوں کا زور ٹوٹا جو مذہب کو کوئی حیثیت ہی نہ دیتے تھے اور صرف اقتصادی مسائل کے حل میں ایک ملک کے عوام کی نجات دیکھتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ موثر اور معروف نعرہ مولانا کے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد ہی اعتبار حاصل کر سکا۔ "پاکستان کا مطلب کیا..... لاالہ الا اللہ"

اور پھر اس نعرے کے مقابلے میں تمام نعرے ماند پڑ گئے۔ دنیا کو یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ اس ملک میں سب سے اہم مسئلہ مذہب کا ہے اور اسے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حل کئے بغیر یہاں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔

یقیناً آپ ان مولانا کا نام جاننے کے لیے بے چین ہوں گے جنہوں نے قیام پاکستان کے لیے بے پناہ جدوجہد کی اور پاکستان بن جانے کے بعد اس میں اسلام کے نفاذ کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ یہ عظیم اور مثالی مولانا، مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں۔ جنہیں قائداعظم کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا اور جنہوں نے اس پروپیگنڈے کو غلط ثابت کیا کہ پاکستان کا حصول مغرب زدہ لوگوں کا منصوبہ ہے اور وہ اس لیے اس کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں دنیا کے بہت سے فوائد حاصل ہو جائیں۔ مولانا کی شمولیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ پاکستان کا مطالبہ دین اسلام کے تحفظ کے لیے ہے۔ مولانا کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی نماز جنازہ پڑھائی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبند ضلع سہارنپور یوپی بھارت کے ایک ایسے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے جو علمی عظمت اور دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے بہت نمایاں تھا۔ آپ کے والد محترم مولوی فضل الرحمان صاحب ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہ کر ریٹائرڈ ہوئے تھے اور دینی حیثیت سے بھی بہت معزز خیال کئے جاتے تھے۔ مولوی فضل الرحمان صاحب خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان کی اولاد میں سے تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی 10 محرم 1305 ہجری مطابق 1886ء میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کی رہائش دیوبند کے محلہ گدی واڑہ میں تھی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر دینی تعلیم حاصل کی اور پھر اپنی مادر علمی ہی میں ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ مسجد فتح پوری کے مدرسے

میں مدرس کی حیثیت سے خدمات دیں۔ پھر دیوبند آکر دارالعلوم سے وابستہ ہو گئے اور مسلم شریف کا درس دینے لگے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا ڈابھیل چلے گئے۔ یہ مقام بھارت کے مشہور شہر بمبئی کے قریب ہے۔ مسلمانوں نے یہاں ایک دینی درس گاہ قائم کی تھی۔ مولانا تقریباً بارہ سال یہاں رہے۔ طویل عرصہ ڈابھیل میں گزار کر مولانا پھر دیوبند آگئے اور منتظمین کی درخواست پر حسب سابق دارالعلوم سے وابستہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قائداعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ ایک ایسی طاقت ور سیاسی جماعت بن گئی تھی کہ نہ انگریزی حکومت اسے نظر انداز کر سکتی تھی اور نہ ہندو فرقہ پرست۔ پاکستان کا مطالبہ ایک ناقابل تردید سچائی بن چکا تھا اور کامیابی کی منزل بالکل سامنے نظر آنے لگی تھی، پھر بھی دین سے گہرا لگاؤ رکھنے والے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کانگرس کے اس پروپیگنڈے کا شکار تھی کہ یہ مطالبہ ملک کی آزادی کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے کیا گیا ہے اور مسلم لیگ کی پشت پر انگریز کا ہاتھ ہے۔ چالاک ہندو سیاست دان نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی اس پروپیگنڈے کو موثر بنانے میں مصروف تھے۔ لہٰذا نہایت شدت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ نامور علما میدان میں آئیں اور پاکستان کے مطالبے کی حقیقت واضح کریں۔

ایسے حالات میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا غلام مرشد اور دوسرے علمائے کرام کے تعاون سے جمعیت العلمائے اسلام کی بنیاد رکھی اور 1945ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ بات یقیناً مبالغے سے خالی ہے کہ علمائے کرام کی اس جماعت کی تشکیل اور مسلم لیگ میں شمولیت سے حصول پاکستان کی جنگ جیتنے میں بہت مدد ملی۔ بالخصوص صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی کامیابی تو خالصتاً ہمارے انہی بزرگوں کا کارنامہ ہے۔

سب اس بات سے واقف ہیں کہ صوبہ سرحد میں کانگرس کا بہت زور تھا اور اس دم خم کی وجہ سے ہندوؤں نے یہ اندازہ کیا تھا کہ مسلم لیگ اس صوبے سے پاکستان کے حق میں ووٹ حاصل نہ کر سکے گی۔ لیکن جب مولانا شبیر احمد عثمانی نے صوبے کا طوفانی دورہ کیا اور حریت پسند پختونوں کے سامنے صحیح حالات رکھے تو فضا یکسر بدل گئی اور اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے دی اور یوں اس صوبے میں ہندو سیاست کا طلسم ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اسی طرح حصول پاکستان کی جنگ کے ان آخری مرحلوں میں جو یقیناً فیصلہ کن تھے، مولانا نے مختلف محاذوں پر نہایت قیمتی خدمات انجام دیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی ایک مقبول سیاست دان، جید عالم، بے مثال خطیب اور بے بدل مبلغ تھے۔ آپ کو اسلام کے ساتھ والہانہ محبت اور عشق تھا۔ کانگرس جن دنوں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوششیں کر رہی تھی یہ ان دنوں کا ایک واقعہ ہے: گائے ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ مسلمان اسے حلال کر کے کھاتے تھے لیکن ہندو اسے پوتر سمجھ کر مسلمانوں کے اس عمل سے نالاں ہوتے تھے۔ کانگرسی علما گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلے پر بھی غور و خوض کرنے لگے تھے۔ لیکن اس موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے وحی الٰہی کا حوالہ دے کر کہا "اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ سے فرمایا کہ اے نبیؐ اللہ نے جس چیز کو آپ کے لیے حلال کیا ہے اس کو کیوں حرام کرتے ہیں"۔

اس کے بعد مولانا عثمانی نے مزید کہا "اگر نبی اکرمؐ کو بھی کسی چیز کے خود حلال و حرام کرنے کا اختیار نہ تھا تو اور کسی کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر میں غیر مسلموں کی خوشنودی کے لیے حلال سے ممانعت کی تلقین کرے"۔

حصول پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے یقیناً مولانا کی بے پناہ خدمات ہیں مگر افسوس کہ مولانا زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے۔ دسمبر 1949ء میں آپ بہاول پور کے شہر بغداد الجدید میں ایک اسلامی مدرسہ کا افتتاح کرنے تشریف لے گئے جہاں 13 دسمبر کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ کراچی میں اے ایم قریشی کے اسلامیہ کالج کے احاطہ میں آپ کو دفن کیا گیا۔ بعد ازاں انہیں کے پہلو میں مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی جگہ ملی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

کھیلوں کی دنیا

این الطاف

چھٹی ہاکی ٹسٹ سیریز

ہاکی پاکستان کا قومی کھیل ہے۔ پوری دنیا میں اپنے ملک کے تشخص کو اجاگر کرنے میں اس کھیل نے ماضی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ صرف اولمپکس میں ہی ہاکی کی کامیابیاں اس قدر شان دار ہیں کہ اسے تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جا سکتا ہے۔ 1924ء میں پیرس (فرانس) میں ہونے والے اولمپکس میں برصغیر یعنی غیر منقسم ہندوستان کی مضبوط ہاکی ٹیم نے پہلی بار شرکت کی اور پہلی ہی بار طلائی تمغہ جیت کر ایک سنہری دور کا آغاز کیا۔ اس کے بعد 1960ء تک اولمپکس ہاکی میں بھارت کا راج رہا۔ اس دوران میں دنیا بھر کی ہاکی ٹیموں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح بھارت کو شکست دے دیں۔ لیکن وہ اس میں کام یاب نہ ہو سکے۔ 1960ء کے روم اولمپکس میں پاکستان نے اپنی چوتھی اولمپکس شرکت ہی میں بھارت کی اس 32 سالہ برتری کا خاتمہ کر دیا اور پاکستان پہلی مرتبہ اولمپکس چیمپئن بن کر ابھرا۔ 1947ء سے بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے سخت حریف رہے ہیں اور یہ کش مکش اب تک جاری ہے اور اب پاکستان اور بھارت کھیلوں کی دنیا میں روائتی حریف کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ کا میچ ہو یا ہاکی کا، مسلح جنگ ہو یا کوئی اور مقابلہ، پاکستانیوں کا جوش و خروش دیدنی ہوتا ہے۔ حال ہی میں کھیلی جانے والی چھٹی پاک بھارت ہاکی سیریز میں پاکستانیوں کے ولولے نے ایک بار پھر برصغیر میں ہاکی کے کھیل کو امر کر دیا۔

26 مارچ 1998ء کو بھارت کے ہاکی اسٹیڈیم، چنائی میں 20 ہزار کے قریب تماشائی پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلی جانے والی ٹسٹ سیریز کا آخری میچ دیکھنے کے لیے موجود ہیں۔ کھیل اپنے مقررہ وقت سے 20 منٹ دیر سے شروع ہوا۔ کھیل کے پہلے ہاف میں سخت مقابلے کے باوجود دونوں ٹیمیں گول کرنے میں ناکام رہیں۔ دوسرے ہاف کے 15ویں منٹ میں پاکستان کے مایہ ناز فارورڈ شہباز احمد سینئر نے گول کر کے پاکستان کو برتری دلوادی۔ اس کے بعد بھارت کی ٹیم نے بھی پاکستان کے گول پر حملے تیز کر دیئے مگر پاکستانی کھلاڑی نہ صرف ان کی ہر کوشش ناکام بناتے رہے بلکہ مزید گول کرنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ چوکس ہو گئے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد پاکستانی ٹیم کے کپتان طاہر زمان نے گول کر کے پاکستان کی فتح کو یقینی بنا دیا۔ یوں پاکستان نے یہ مقابلہ 2:0 سے جیت کر چھٹی پاک بھارت ٹسٹ سیریز جیتنے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

یہ ٹسٹ سیریز دو مرحلوں میں کھیلی گئی۔ پہلے مرحلے کے دو ٹسٹ میچوں میں سے پہلا 28 فروری 1998ء کو پشاور میں کھیلا گیا۔ اس میچ میں بھی پاکستان نے بھارت کو 4:1 سے ہرا کر پہلا ٹسٹ جیت لیا، اور دوسرا ٹسٹ

میچ جو یکم مارچ 1998ء کو راول پنڈی میں کھیلا گیا' پاکستان نے 2:1 سے جیت لیا۔ یوں یہ دونوں میچ پاکستان نے جیت لیے جب کہ بھارت نے 4 مارچ کو لاہور میں اور 7 مارچ کو کراچی میں ہونے والے دونوں ٹسٹ جیت لئے۔ اس طرح 4 ٹسٹ کا پہلا مرحلہ برابر رہا اور کوئی ملک بھی ایک دوسرے پر برتری حاصل نہ کر سکا۔

دوسرے مرحلے میں پاکستان کی ٹیم بھارت گئی۔ بھارت نے 19 مارچ کو نئی دہلی میں ہونے والا پانچواں ٹسٹ جیت کر 3:2 سے برتری حاصل کر لی جب کہ 21 مارچ کو جالندھر میں ہونے والا چھٹا ٹسٹ برابر رہا اور 24 مارچ کو حیدر آباد دکن میں ہونے والا ساتواں پاکستان نے جیت لیا۔ یوں ان سات ٹسٹ میچوں میں دونوں حریف واضح برتری حاصل نہ کر سکے۔ اب آٹھواں ٹسٹ فیصلہ کن تھا۔ پاکستان کے مایہ ناز کھلاڑیوں نے یہ ٹسٹ 4:3 سے جیت کر ایک بار پھر فتح پاکستان کی جھولی میں ڈال دی اور پوری دنیا میں اپنے پیارے وطن کا نام مزید روشن کر دیا۔

چھٹی ٹسٹ سیریز میں کل آٹھ مقابلے ہوئے۔ جس میں پاکستان نے 17 اور بھارت نے 13 گول کیے۔ اس ٹسٹ سیریز سے پہلے پاکستان اور بھارت کے درمیان جو پانچ ٹسٹ سیریز کھیلی جا چکی ہیں ان میں پاکستان تین میں اور بھارت دو میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ ان سیریز میں دونوں ٹیموں کے درمیان کل بیس میچ کھیلے جا چکے ہیں۔ جن میں سے نو

پاکستان نے اور سات بھارت نے جیتے۔ جب کہ چار برابر رہے۔ اس سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان آخری بار 1985ء میں ٹسٹ سیریز ہوئی تھی۔ اس طرح اب 13 سال بعد 28 فروری 1998ء کو چھٹی ہاکی ٹسٹ سیریز ہوئی۔ دونوں روائتی حریف ٹیموں نے شان دار کھیل پیش کر کے ہاکی کے شائقین سے داد وصول کی اور ایک بار پھر پاکستان نے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے بہت عرصے بعد اتنی شان دار کامیابی حاصل کی ہے۔

پاکستان ہاکی فیڈریشن کے سیکریٹری کرنل مدثر اصغر کا کہنا ہے کہ اب یہ ٹسٹ سیریز ہر سال باقاعدگی سے ہوا کرے گی۔ اس ٹسٹ سیریز سے ورلڈ کپ 1998ء کی تیاری میں مدد ملے گی جو 21 مئی سے یکم جون تک ہالینڈ کے شہر الرخ میں منعقد ہو رہا ہے۔ پاکستان کو پول بی میں جب کہ بھارت کو پول اے میں رکھا گیا ہے۔ پاکستان اس ورلڈ کپ کے لیے پہلا میچ 21 مئی 1998ء کو ملائیشیا کے خلاف کھیلے گا۔ ورلڈ کپ 1998 میں دنیا بھر کی بارہ نام ور ٹیمیں شرکت کر رہی ہیں۔

ہاکی پاکستان کا قومی کھیل ہے اور ہمارے ملک کے کھلاڑی ان شاء اللہ اپنی اس قومی شناخت کو نمایاں سے نمایاں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ چار سال پہلے 1994ء میں منعقد ہونے والے ورلڈ کپ کو جیتنے کا اعزاز بھی پاکستان کو حاصل ہے۔ اس وقت پاکستانی ٹیم کی قیادت شہباز احمد سینئر نے کی تھی جب کہ اب موجودہ کپتان طاہر زمان اور ان کے ساتھی اپنے اس ٹائٹل کا دفاع کریں گے۔

شرارتی لکیریں

شاہد ریاض شاہد

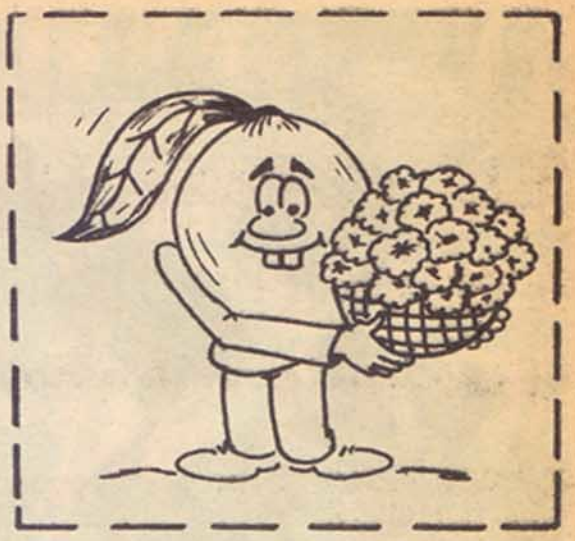

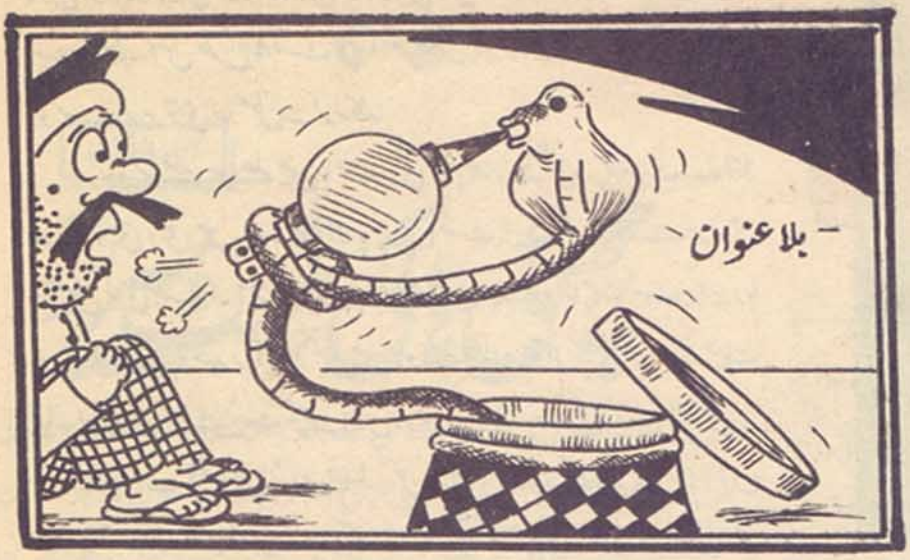

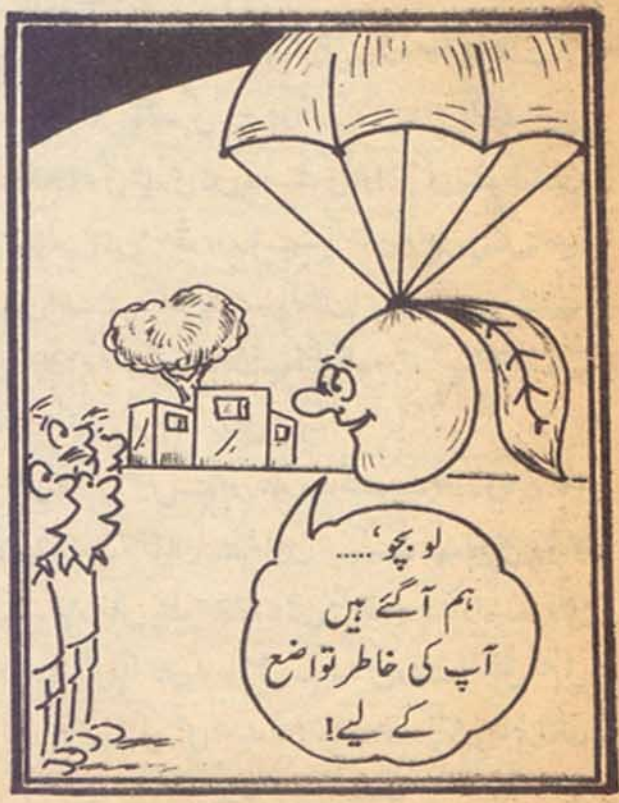

ایک صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے فٹ پاتھ پر جا رہے تھے کہ ایک لڑکی کو دیکھ کر رک گئے اور بولے: میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔
لڑکی نے کہا: ضرور دیکھا ہو گا میں پاگل خانے میں نرس ہوں (اسامہ جلیل چکوال)

مجسٹریٹ (جیب کترے سے): تم نے اس آدمی کی جیب سے بٹوا کس طرح نکال لیا کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔
ملزم (غرور سے): جناب اس علم کو سکھانے کی فیس پانچ سو روپے ہے (عمران علی قادر آباد)

احمد (ارشد سے): یار مجھے لگتا ہے کہ میری بے خوابی بڑھتی جا رہی ہے۔
ارشد: تمہیں یہ احساس کیسے ہوا؟
احمد: کل کلاس میں میری دو مرتبہ آنکھ کھلی تھی
(کنول ایاز، مقام نہیں لکھا)

مالک (نوکر سے): جاؤ اندر سے انسائیکلو پیڈیا لاؤ۔ نوکر تھوڑی دیر بعد آ کر بولا: "یہ لیجئے"۔
مالک: ارے! یہ کیا اٹھا لائے ہو۔
نوکر: وہی جو آپ نے کہا، سائیکل کا پیڈل
(ہما فاروق کوٹیاں)

کسٹم آفیسر: میں نے بہت دفعہ تمہارے ٹرک کی تلاشی لی مگر کچھ برآمد نہیں ہوا، تم کیا کاروبار کرتے ہو؟
آدمی: میں اسمگلنگ کرتا ہوں۔
کسٹم آفیسر: مگر کبھی کچھ برآمد نہیں ہوا۔ تم اسمگل کیا کرتے ہو؟
آدمی: ٹرک (جنید ارشد، فرید ٹاؤن ساہی وال)

ڈاکٹر (مریض سے): جی فرمایئے آپ کو کیا بیماری ہے؟
مریض: دریا کے اس پار سیبوں کا باغ ہے۔ شام کے وقت بہت سے بندر وہاں آتے ہیں۔ وہ کچھ سیب توڑ کر پھینک دیتے ہیں کچھ کھا لیتے ہیں اور بڑی بھیانک آوازیں نکالتے.....
ڈاکٹر (اکتاتے ہوئے): اوہو بھئی میں نے آپ سے بیماری کے متعلق پوچھا ہے اور آپ کہانی سنانے بیٹھ گئے۔
مریض: دراصل مجھے کہانیاں سنانے کی ہی بیماری ہے۔ (تحریم کنزہ لاہور)

ایک آدمی کو موسیقی کا نیا نیا شوق ہوا تو وہ بازار سے ایک پرانا پیانو خرید لایا اور رات کے ایک بجے مشق کرنے لگا۔
اس آدمی کے پڑوسی کو غصہ آگیا اور اس نے رات کو ہی اس نئے موسیقار کی تمام کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ نیا موسیقار اس وقت تو چپ ہو گیا مگر صبح کو اپنے پڑوسی سے کہنے لگا "اگر آواز کم آ رہی تھی تو مجھے بتا دیا ہوتا، میں خود کھڑکیاں کھول دیتا"
(محمد عرفان بھٹی کوٹلی لوہاراں مغربی)

شاہد ریاض شاہد

ملا نصر الدین گئے شکار کھیلنے

ایک دن ملا نصر الدین ایک باغ میں شکار کھیلنے گئے۔ وہاں ایک درخت پر لکھا تھا "یہاں سے پرندوں کو پکڑنا یا مارنا منع ہے"

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا تو ان کو وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

ملا نے جھٹ سے اپنی قیمتی غلیل نکالی اور پھر مسکرا کر اپنی کارروائی کا آغاز کرنے لگے

ادھر ادھر دیکھنے پر ملا کو
ایک توتا نظر آیا۔ ملا نے
اسے شکار کرنے کا فیصلہ
کیا۔ اور پھر غلیل کا نشانہ
اس توتے پر باندھا

مگر ہوا کچھ اور ہی،
ملا کے ہاتھ سے ان کی
غلیل چھوٹ گئی اور ہوا
میں لہرانے لگی

ملا کی غلیل وہیں جا کر
اٹک گئی جہاں توتا بیٹھا
تھا اور ملا آنسو بہاتے
ہوئے باغ سے واپس آگئے

خالی جگہ پر کیجئے۔

یہ جملے اسے شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1۔ یہی دونوں صفات اس دنیا کا -------- ہیں۔

2۔ مگر افسوس کہ میرے پاس تو ایک ہی ---------- ہے۔

3۔ جو لوگ -----کی خاطر جان دے دیتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔

4۔ ------- کے پاس نہ جاؤ

5۔ ہم اس گٹھڑی سمیت سیدھے ------- کے پاس جائیں گے۔

6۔ واقعی ------ میں موجود چیزوں پر غور و خوض کرنے سے کوئی نہ کوئی اچھا سبق ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

7۔ کیوں کہ وہ اس سے اپنی ------- دکان داری چمکانا چاہتے ہیں۔

8۔ پاکستان نے اپنی چوتھی ---------- شرکت ہی میں بھارت کی اس 32 سالہ برتری کا خاتمہ کر دیا۔

9۔ دنیا کو یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ اس ملک میں سب سے اہم مسئلہ ------ کا ہے۔

10۔ سچ رحمت بن کر واپس آیا ہے ہمارا ------- تو۔

پہلا انعام	بالکل صحیح حل	100 روپے کی کتابیں
دوسرا انعام	ایک غلطی	90 روپے کی کتابیں
تیسرا انعام	دو غلطیاں	80 روپے کی کتابیں
چوتھا انعام	تین غلطیاں	70 روپے کی کتابیں
پانچواں انعام	چار غلطیاں	60 روپے کی کتابیں
چھٹا انعام	پانچ غلطیاں	50 روپے کی کتابیں

کسی بھی انعام کے لیے ایک سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہو گا۔ البتہ تمام درست حل موصول ہونے کی صورت میں انعامات کی درجہ بندی بذریعہ قرعہ اندازی ہو گی۔

جوابات داؤدی علمی آزمائش اپریل 1998

(2) راضی برضا (2) مٹھی بھائی شیریں (3) انصاف (4) کنکر (5) کرشین (6) دوست (7) ڈانٹ (8) یو کبد (9) ماں (10) لوہالی

اس ماہ 2481 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان چھ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

- فیصل شہزاد، لاہور (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- ناعمہ کرن، ملتان (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- علی معاذ، گوجرانوالہ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- سمیرا الطاف، لاہور (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)
- عائشہ ظفر بٹ، کھاریاں (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)
- محمد ابو بکر طاہر، پنڈ دادنخان (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جا رہے ہیں۔

محمد اسامہ ساہی وال۔ ثروت وحید بہاول پور۔ محمد نعیم اختر بہاول پور۔ رابعہ سعید اعوان ملتان۔ عمارہ خالد لاہور۔ ارم سرور گکھڑ منڈی۔ عینی سلیم چشتیاں۔ حسن فرخ ملتان۔ عاصم حبیب کراچی۔ محمد اختر سلیم بلوچ ڈیرہ اسماعیل خان۔ مہوش اعوان سیال کوٹ۔ رانا وقاص اللہ واہ چھاؤنی۔ رخسانہ کوثر قصور۔ تہمینہ افضل تارڑ لاہور۔ نفیسہ خان لاہور۔ ممتاز بشیر کاہنہ نو۔ ربیعہ اطہر فیروز والہ۔ حنا بٹ لاہور۔ لینہ طیبہ قصور۔ مہوش قیوم فیصل آباد۔ زوہیب رفیع راول پنڈی۔ میمونہ ملک چنیوٹ۔ رومیہ منیر خانیوال۔ مدیحہ علی لاہور۔ سمیرا خانم قصور۔ روبینہ یاسین منڈی بہاء الدین۔ عائشہ اسلم رحیم یار خان۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 7 مئی

دماغ لڑاؤ

نام _____

مقام _____

پتا _____

_____

بشیر احمد ناز جلال پور بھٹیاں۔ مبشر حسن انصاری بہاول پور۔ راضیہ رحمان لاہور۔ مدثر سلیمان فیصل آباد۔ شبانہ ظفر اوکاڑہ چھاؤنی۔ سیدہ کرن زہرا نواں کوٹ۔ ثمینہ خالد واہ چھاؤنی۔ فرح انور خانیوال۔ زاہدہ شاہ ٹل سٹی۔ سدرہ نور اسلام آباد۔ حافظہ مریم نعیم لاہور۔ ذی شان عارف لاہور۔ طیبہ سلیم لاہور۔ فریحہ گوہر فیصل آباد۔ عنبرین جاوید گجرات۔ ذوالفقار حیدر راجپوت سنجھورو۔ خدیجہ عنائت لاہور۔ اسما یونس اسلام آباد۔ مدیحہ ناصر لاہور۔ مدیحہ ڈیوڈ خانیوال۔ اعجاز علی بہاول پور۔ اسما لطیف لاہور۔ خلیل احمد ملک فیصل آباد۔ محمد شاہد یونس لاہور چھاؤنی۔ سید سلمان علی لاہور۔ نوید مظہر لاہور۔ شہباز حامد لاہور۔ احسن منظور منڈی بہاء الدین۔ عطاء المصطفےٰ جمیل حویلی لکھا۔ مدیحہ اشرف ملک لاہور۔ شازیہ ارشد جہلم۔ عدنان طارق بٹ وزیر آباد۔ منصور احمد لاہور۔ محمد نعیم شہزاد لاہور۔ ارفع فاروقی لاہور۔ تسلیم عارف فیصل آباد۔ محمد عبدالوہاب جھنگ۔ حسن مصطفےٰ لاہور۔ محمد عادل کوہاٹ۔ حسیب ناصر ظفر لاہور۔ افتخار ندیم لاہور۔ سدرہ رحیم اورکزئی پشاور۔ شائستہ سحر فاطمہ رحیم یار خان۔ محمد فہیم فرحان ڈیرہ غازی خان۔ ظل ہما زبیر لاہور۔ عدیل راول پنڈی۔ ثنا جاوید فیصل آباد۔ منزہ نثار جلال پور جٹاں۔ مبشر ریحان ملکوال۔ مسرت نورین خانیوال۔ مبارک احمد سکندر فیروز وٹواں۔ خاتون زارا اکبر لاہور۔ صبا اقبال لاہور۔ آصف حفیظ لاہور۔ ثنا سلطان فیصل آباد۔ صدف اشرف فیصل آباد۔ اظہر اقبال لاہور۔ مدیحہ وڑائچ لاہور۔ زینب شریف فیصل آباد۔ ذیشان انجم گوجرانوالہ۔ مریم سعید بٹ سرگودھا۔ شہباز منظور اوکاڑہ۔ صالحہ مظہر اسلام آباد۔ ثنا خان ایبٹ آباد۔ محمد نوید سرابہ۔ معظم علی ہارون آباد۔ محمد علی صیام سنجوال چھاؤنی۔ علی ذیشان فیصل آباد۔ زرتاش پرویز عاشی لالہ موسیٰ۔ سبحان علی خان لاہور۔ یاسین محمود واہ چھاؤنی۔ عمران چاند لاہور۔ وجیہہ ڈار لاہور۔ مریم فخر قریشی لاہور۔ مہرین قریشی لاہور۔ ایمن خواجہ لاہور۔ علی احمد شیخ لاہور۔ صدف شہزادی مورگاہ۔ سیدہ صائمہ ترمذی فیصل آباد۔ تسنیم اطہر لاہور۔ نورالعین لاہور۔ زبیر رفیق فیصل آباد۔ اعجاز انجم بھلوال۔ زلیخہ غنی میانوالی۔ آسیہ اعجاز پیر محل۔ اسامہ اکرام جوہر آباد۔ قرطبہ سعدیہ لاہور۔ ملک اشتیاق محمود اعوان رکھی۔ جواد ظفر میرپور۔ محمد رحمت اللہ بشیر گجرات۔ مہوش یونس لاہور۔ فریال، سلمان، فرحین بورے والا۔ نگینہ رفیق لاہور۔ ریحان احمد قریشی راول پنڈی۔ نجم الثاقب کوہاٹ۔ رضوان حیدر لاہور۔ عبدالرافع اقبال فیصل آباد۔ محمد عرفان بھٹی کوٹلی لوہاراں۔ ثوبیہ نورین ملک جنڈیلہ۔ نعمان توصیف احمد اسلام آباد۔ نبیل رشید اوکاڑہ۔ تنویر مہتاب احمد بھٹی رحیم یار خان۔ صدف سلیمان جھنگ۔ نازیہ خان گوجر خان۔ طاہر محمود بٹ فیصل آباد۔ احمد مشتاق سرائے عالم گیر۔ سعدیہ رسول سرگودھا۔ ماریہ معین لاہور۔ عاصمہ منیر راول پنڈی۔ محمد عمر عارف سیال کوٹ۔ محمد بلال عبدالرزاق فیصل آباد۔ محمد منیب احمد کمال پور۔ رضوان ادریس لاہور۔ محمد انیس الرحمان ملتان۔ ثمرہ ارشد جہلم۔ مدیحہ اکرم کوٹ ادو۔ ذیشان منیر لاہور۔ شہزاد سلطان حافظ آباد۔ فرح اکبر سرگودھا۔ نبیلہ حسن خواجہ لاہور۔ عنبرین انجم ملتان۔ عارفہ جاوید بیگ لاہور۔ صبا مریم لاہور۔ شمس الرحمان عباس ایبٹ آباد۔ کرن اسلام آباد۔ ایم زیڈ سلیم میاں چنوں۔ محمد شکیل اوکاڑہ۔ اجمل جمشید جاوہ۔ سلیمہ امین پشاور۔ شیخ خاور حمید سرگودھا۔ محمد مالک چیچہ وطنی۔ فیصل رؤف شہزاد تلہ گنگ۔ عمار فضل عارف والا۔ اشفاق احمد لاہور چھاؤنی۔ محمد اسامہ ساہی وال۔ ثروت وحید بہاول پور۔ محمد نعیم اختر بہاول پور۔ رابعہ سعید اعوان ملتان۔ عمارہ خالد لاہور۔ ارم سرور گکھڑ منڈی۔ عینی سلیم چشتیاں۔ حسن فرخ ملتان۔ عاصم حبیب کراچی۔ محمد اختر سلیم بلوچ ڈیرہ اسماعیل خان۔ مہوش اعوان سیال کوٹ۔ رانا وقاص اللہ واہ چھاؤنی۔ رخسانہ کوثر قصور۔ تہمینہ افضل تارڑ لاہور۔ منہل خان لاہور۔ ماجد خان جمالی کراچی۔ صائمہ جہان ہنگو۔ فائزہ انوار فیصل آباد۔ ہما فاروق کوٹیاں۔ محمد بلال پوٹہ۔ عنبرین اسلم مغل لاہور۔ وقاص اکرم چشتیاں۔ محمد بلال طارق ساہی وال۔ عائشہ شاہد سرگودھا۔ نایاب بٹ محمد پورہ۔ بینش سلیم لاہور۔ سید شعیب احمد واہ چھاؤنی۔ عائشہ طاہر رحیم یار خان۔ شمائلہ ذوالفقار لاہور۔ ثنا چاند بھکر۔ مجتبیٰ علی گوجرانوالہ۔ صبیحہ ضیا تبسم ہارون آباد۔ ثمینہ بی بی اسلام آباد۔ پیر علی حماد نقوی بھلوال۔ مظہر فرید وہاڑی۔ ارشاد مسیح تلہ گنگ۔ شہزاد حسن رفیق شورکوٹ۔ عائشہ عبدالرحمان کامونکی۔ فہمینہ مسعود لاہور۔ سدرہ سلیم لاہور۔ عبدالرشید بورے والہ۔ نادیہ ارم لاہور۔ شہلا ہمدانی قصور۔ بلال بیگ لاہور۔ اعجاز حسین بہاول نگر۔ اظہر عباس چنیوٹ۔ افتخار منور بہاول پور۔ عالیہ بنت ثناء اللہ بہاول پور۔ محمد اسامہ سعید فیصل آباد۔ محمد شعیب اٹک۔ حسن محمود میرپور۔ سلیم جہانگیر خان کراچی۔ زوار سید علی رضا رضوی گجرات۔ ملک ثاقب محمود کھاریاں۔ سعدیہ ناز صدیقی لاہور۔ وفا باجوہ اسلام آباد۔ محمد عبداللہ لاہور۔ نائلہ کنول فیصل آباد۔ سونیا سلیم گوجرانوالہ۔ محمد یاسر اقبال لاہور۔ حامد مسعود گجرات۔ طارق عزیز کوہاٹ۔ فصیحہ زرین ملتان۔ سعدیہ عزیز کوہاٹ۔ میمونہ فاروق راول پنڈی۔ محمد جنید عبدالرزاق کراچی۔ عمر بشیر میو لاہور چھاؤنی۔ نوشین اختر میرپور۔ عمران خان پشاور۔ ذلیخان سولنگی گڈو۔ عابد عظیم خان خانیوال۔ سدرہ جمال فیصل آباد۔ مزمل جبین فیصل آباد۔ خدیجہ طارق سرگودھا۔ محمد شاہد اقبال مخدوم پور پہوڑاں۔ ماریہ سلیم لاہور۔ نرگس افضل میرپور۔ محمد گلریز پال سیال کوٹ۔ سائرہ ممتاز لاہور۔ ریحانہ جاوید میلسی۔ بلال احمد ملتان۔ اقصیٰ رؤف لاہور۔ فیاض سعید لاہور۔ عاطف لطیف حسن ابدال۔

بخت رسا

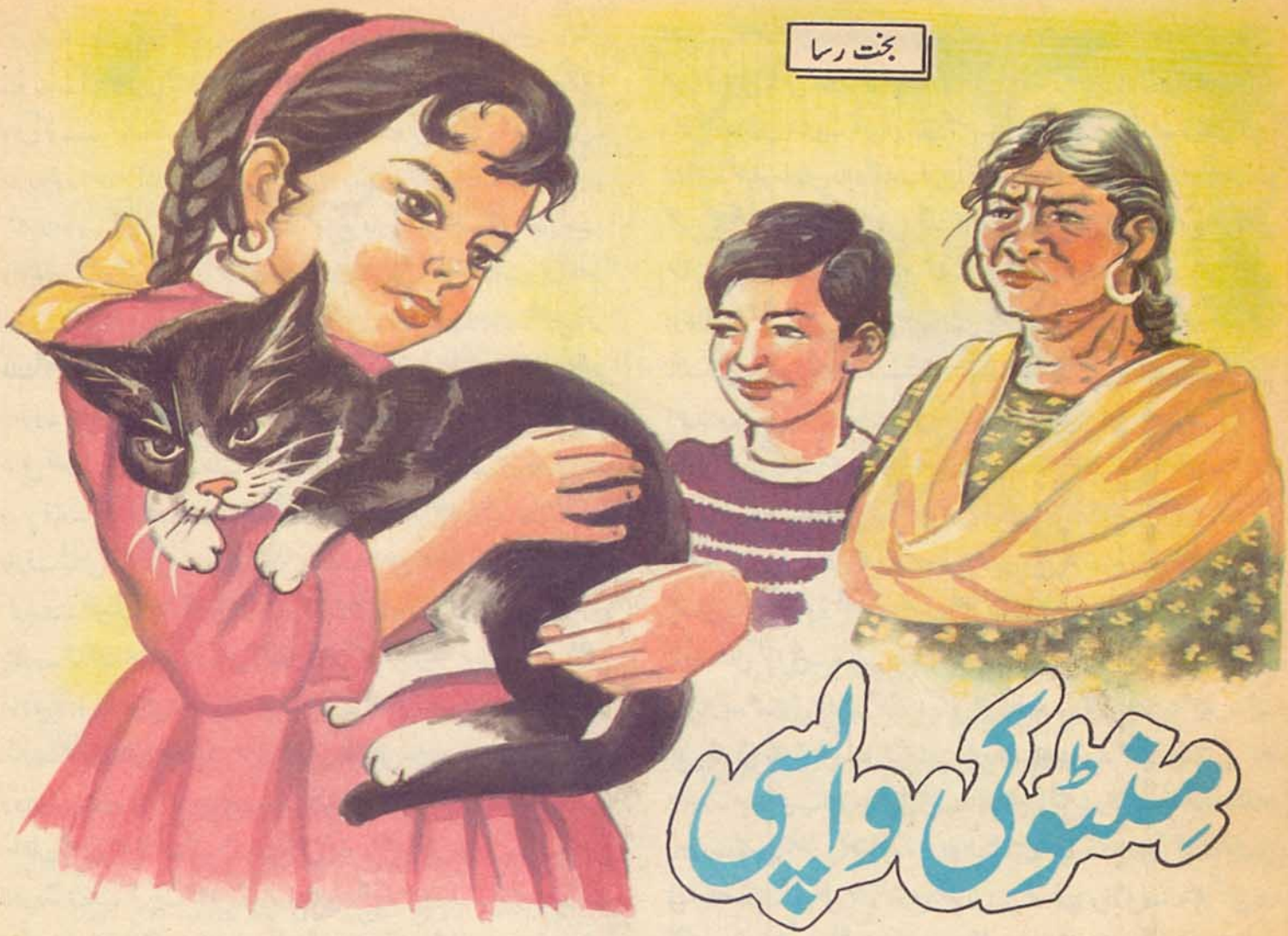

منٹو کی واپسی

یہ بات میری سمجھ میں ہرگز نہ آتی تھی کہ دادی جان جیسی مہربان خاتون کو منٹو سے اس قدر چڑ کیوں تھی۔ منٹو کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے جیسے کوئی کڑوی دوا پی رہی ہوں۔ منٹو سے میرا والہانہ لگاؤ کچھ زیادہ پرانا بھی نہ تھا۔ اب سے کوئی 2 سال پہلے جب عاصم بھائی صبح صبح دو ڑ لگا کر واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک گول مٹول سیاہ بالوں والا' قدرے موٹا بلی کا بچہ تھا۔

"ہائے بھائی' یہ کہاں سے ملا"؟ اسے دیکھتے ہی میں اشتیاق سے قریب آتے ہوئے بولی۔

"یہ موڑ والے تنور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آوارہ ہے' بس میں لے آیا" یہ کہہ کر انہوں نے بلونگڑا مجھے پکڑا دیا۔ "ہم پالیں گے!" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے اعلان کیا۔ پھر امی اور دادی جان کو عاصم بھائی کی یہ دریافت دکھانے چل پڑی۔ لیکن ان دونوں کے تاثرات دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ "اف کتنا بدصورت ہے!" دادی جان اس کو خفگی سے گھورتے ہوئے بولیں۔

"گڑیا' خاصا ڈرونا ہے!" امی نے کچھ رک کر کہا۔

"ہوہائے! امی آپ ڈرتی ہیں' دیکھیں تو کتنا نرم ہے!" میں نے ہاتھ اوپر کر کے بلونگڑے کو ان کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے کہا تو وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئیں۔

"گڑیا! فوراً اس بلا کو لے کر باہر جاؤ" دادی جان نے مجھے جھڑک کر حکم دیا تو میں اچھلتی کودتی باغ میں آگئی اور پھر نجانے کیوں اور کیسے میں نے شام تک اس کا نام منٹو رکھ دیا۔ لیکن منٹو کو اس نام سے صرف میں یا ماسی ہی بلاتے تھے' وگرنہ گھر کے باقی افراد نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق اس کے نام رکھے لیے تھے' دادی جان اسے "کالی بدروح" کہتیں' امی اجنبیت سے کالا بلا پکارتیں' ابو کالو خان جب کہ عاصم بھائی کالا کمانڈو کہتے۔

لیکن اس تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود منٹو ہمارے گھر میں رہنے لگا۔ منٹو خاصا صاف ستھرا تھا لیکن مزاج کا کافی فری اسٹائل تھا' یعنی جب دل کرتا کمروں میں گھس آتا۔ موڈ بنتا تو باورچی خانے میں بھی تانکا جھانکی کرلیتا۔ لیکن یہاں اس پر فوراً ہی دادی جان کی چھڑی لہراتی۔ پھر وہ دم دبا کر بھاگ جاتا۔ منٹو کو دراصل ہر اس جگہ گھسنے کا شوق تھا جہاں اس کا داخلہ ممنوع ہوتا۔ مثلاً ٹیلی فون کی میز کے نیچے' برتنوں والی الماری اور کھانے کی میز کے اوپر' کپڑوں والے بڑے بکس کے پیچھے۔ سونے کے لیے اس نے گھر میں دو خاص مقامات چنے تھے۔ ایک تو ڈرائنگ روم میں رکھے دادا جان کے زمانے کے صوفے کے پیچھے اور دوسرا دادی جان کے جہازی جسامت کے پلنگ کے نیچے۔ ان کے علاوہ وہ اکثر اسٹور میں رضائیوں کے اوپر سویا پایا جاتا تھا۔ لیکن اپنی ان تمام تر الٹی سیدھی حرکتوں کے باوجود منٹو میرے علاوہ عاصم بھائی کو بھی خاصا عزیز ہو گیا تھا۔ اور امی بھی اس کی خوراک کا خوب خیال رکھتی تھیں۔ جس کی بدولت منٹو کچھ ہی عرصے میں خاصا موٹا تازہ اور قدر آور ہو گیا۔

اسکول سے واپسی پر میرا زیادہ تر وقت منٹو کے ساتھ ہی گزرتا اور جب میں شام کو باغ میں اس کے ساتھ کھیلتی تو دادی جان کو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اسکول میں بھی میں زیادہ وقت منٹو ہی کی باتیں کرتی رہتی۔ پیر کے روز میں حساب کے پیریڈ میں اپنے برابر بیٹھی سیما کو بتا رہی تھی کہ کل منٹو کس ہوشیاری سے میرے کمرے میں آگیا کہ مس عالیہ کی آواز گونجی "سیما! کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟"

سیما گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور بولی "ٹیچر یہ وہ گڑیا نا اپنے منٹو کی باتیں کر رہی ہیں"۔

"منٹو! یہ منٹو کیا ہے گڑیا؟" سیما کی بات سن کر مس عالیہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

میں تو جیسے موقعے کی تلاش میں تھی' جھٹ سے کھڑی ہو کر منٹو صاحب کے ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں ایک تعارفی اور تعریفی تقریر کر ڈالی۔ باقی بچے ہنسنے لگے۔ مس کچھ دیر تو خاموشی سے سنتی رہیں پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے بٹھایا اور بولیں "گڑیا فی الحال تو تم اپنے سوال حل کرو' اور منٹو سے ملوانے تم اپنی سہیلیوں کو گھر لے جانا" مس نے تو شاید یہ بات خاموش رکھنے کے لیے کہی تھی لیکن مجھے ان کا مشورہ بہت بھایا اور پھر اگلے ہی دن میں سیما' کرن' آسیہ' آمنہ اور مدثرہ کے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ اسکول سے گھر لے آئی تاکہ ان کو اپنے منٹو سے ملا سکوں۔ منٹو اس وقت صحن میں دھوپ میں پڑا اینٹھ رہا تھا۔ میں سب کو لے کر اس کے پاس گئی تو پہلے تو وہ نخرے سے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر سب کو دیکھنے لگا' پھر یک دم مدثرہ کے چھوٹے بھائی عمران کے پیروں میں لاڈ سے لوٹنے لگا۔ ننھے عمران کی آنکھیں حیرت اور خوف سے کچھ اور گول ہو گئیں اور منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر سخت ہراساں کھڑا رہا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر مدثرہ بیگم نے منٹو کو ایک زوردار لات رسید کی۔ بے چارا منٹو دور جا پڑا۔ "یہ کیا کیا ہے؟" میں چیخی اور لپک کر منٹو کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ مدثرہ سمیت سب کھی کھی دانت نکالنے لگیں۔ "کتنا گندہ ہے! کالا سا!" آمنہ نے نفرت کا اظہار کیا۔

مجھے شدید دکھ ہوا۔ منٹو منہ اٹھائے دیکھ رہا تھا جیسے کہ رہا ہو "ہونہہ تو یہ ہیں تمہارے انگریزی میڈیم اسکول کے پڑھے لکھے دوست' ارے ان گنواروں سے تو میں پینڈو' بے زبان' جانور ہی اچھا ہوں"۔

اسی وقت ننھا عمران آگے بڑھا' بہن نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ لپک کر میرے قریب آگیا اور بہت محبت سے منٹو کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شاید وہ بڑی بہن کی بدتمیزی کی تلافی کرنا چاہتا تھا' لیکن میں اس کے بعد کلاس میں منٹو کی باتیں بہت کم کرتی تھی۔

اگلے اتوار کو چچا جان اپنے اہل و ایال سمیت ہمارے ہاں چھٹی کا دن گزارنے آئے۔ میں چچا جان کے دو سالہ بیٹے اسدی کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں آگئی۔ یہاں منٹو دودھ پی رہا تھا۔ اسدی کچھ دیر تو ساکت کھڑا منٹو کو گھورتا رہا پھر اندر بھاگ گیا۔ ڈرائنگ روم میں آکر اس نے اپنے بازو بھی پیروں کے برابر زمین پر ٹکا لیے اور کمال بے ہودگی سے منٹو کے دودھ پینے کی نقل اتارنے لگا۔ اس پہ نہ صرف چچا اور ابو بلکہ سب سے بڑھ کر دادی جان نے اپنے پوتے کے لیے تالیاں بجائیں۔ لیکن مجھے اسد موٹو کی یہ حرکت ایک آنکھ نہ بھائی "ہونہہ بدتمیز!" میں دل ہی دل میں پھنکاری۔

جاتے ہوئے چچا جان نے ہم سب کو اگلی چھٹی اپنے ہاں گزارنے کی دعوت دی اور امی ابو کے ساتھ دادی جان نے بھی آنے کا وعدہ کرلیا۔

چچا جان کے گھر جانے کا میرا موڈ ہرگز نہ تھا' لیکن ہائے ری مجبوری' امی جان کے حکم پر مجھے کپڑے تبدیل کرنے پڑے۔ کپڑے بدل کر میں کنگھی ہاتھ میں لیے بال بنوانے دادی جان کے پاس آئی۔

"کیا بات ہے گڑیا بیٹی؟" مجھے خاموش پاکر انہوں نے پوچھا۔

"بس ویسے ہی دادی جان" میں نے بے زاری سے کہا۔

"ارے بھئی موڈ ٹھیک کرو' ابھی چچا جان کے ہاں جاکر اپنے ننھے دوست اسدی سے خوب کھیلنا" وہ میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولیں۔

"ہونہہ ننھا دوست اسدی' وہ چھچھورا' بدتمیز' اسد کا بچہ' میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی کی وجہ سے تو میرا مزاج بگڑا ہوا ہے!" دادی جان کی بات سن کر میں نے دل میں سوچا۔ اسد سے تو میں ناراض تھی ہی ساتھ ہی ساتھ مجھے دادی جان پر بھی غصہ آنے لگا' ظاہر ہے وہ بھی تو اسد کا ذکر اتنے دلار سے صرف اس لیے کر رہی تھیں' کیوں کہ اس نے میرے منٹو کی نقل جو اتاری تھی۔

لیکن ابھی ہم گاڑی سے اتر کر چچا جان کے گھر کے اندر داخل ہی ہوئے تھے کہ اسدی مجھ سے آکر لپٹ گیا۔ مجھے تو جیسے اپنی ناراضگی یاد ہی نہ رہی اور ہم باغ میں کھیلنے لگے۔ اتنے میں چچا جان آن پہنچے۔ "چھی! چھی! گڑیا گندی! شرم کرو چوتھی جماعت میں پڑھتی ہو اور اس اسدی موٹو کی طرح مٹی چاٹ رہی ہو۔ ہمیں مٹی کھاتا دیکھ کر وہ چیخے۔

"اوہو چچا جان' میں کھا تو نہیں رہی تھی۔ ذرا چکھ رہی تھی!" میں شرمندہ سی ہو کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی۔ میری بات سن کر وہ سٹ پٹا سے گئے۔ پھر بولے "اچھا اگر مٹی چکھ لی ہو تو اب اندر چل کر کچھ سیب اور آلو کے چپس بھی چکھ لو"۔

چپس کا نام سن کر اسدی اور میں فوراً اندر چلے آئے۔

"اور بھئی تمہارے منٹو میاں کا کیا حال ہے؟" اندر آکر مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے چچا جان نے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہے!" میں نے چپس کھاتے کھاتے کن اکھیوں سے دادی جان کو دیکھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"اچھا ویسے یہ تو بتاؤ کہ اس کالے سے جانور کا نام تم نے "منٹو" کیوں رکھ دیا؟" چچا جان نے دل چسپی ظاہر کی۔

"جانور! منٹو اور جانور!" اب میں سمجھی کہ اسدی نے منٹو کی نقل اس بے ہودگی سے کیوں اتارتی تھی۔ ظاہر ہے جب چچا جان ہی اسے "جانور" کہیں گے تو ان کا بیٹا بھی.... تو میں نے تلملا کر سوچا۔ منٹو کا نام میں نے "منٹو" کیوں رکھا' اس کا جواب سمجھ میں نہیں آرہا تھا لہٰذا میں صرف اپنا سر ہلا کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب بن پڑتا' دادی جان نے ٹوک دیا "آئے ہائے کیا اس منحوس کالے کا ذکر لے بیٹھے ہو"۔ اور میں بالکل چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

چچا جان کے گھر سے واپس اپنے گھر آتے ہی میں منٹو کو گود میں اٹھا کر دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت امی نے مجھے آواز دی لیکن مجھے تو بھوک ہی نہ تھی۔ میں منٹو کو گود میں لیے بیٹھی رہی۔ آخر کھانے کے بعد دادی جان باہر آئیں۔

"آئے ہائے گڑیا! یہ تم اس بدروح کو گود میں لے کر بیٹھی ہو۔ ماں کھانا نکال کر انتظار کر رہی ہے اور یہ اس کالو کے نخرے اٹھا رہی ہے۔ چلو فوراً ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاؤ" دادی جان کڑک کر بولیں تو مجھے اٹھتے ہی بنی۔

اگلے روز جب میں اسکول سے واپس پلٹی تو عاصم بھائی باغ میں بیٹھے فریج کی چوکی پر سفید روغن پھیر رہے تھے۔ "بھائی روغن کر رہے ہیں؟" میں بستہ اٹھائے ان کے پاس پہنچی اور بے مقصد سا سوال کیا۔

"جی ہاں! لیکن پیچھے رہو یہ ابھی گیلا ہے؟" وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولے تو میں چپ کر کے وہیں کھڑی ہو گئی اور انہیں دیکھنے لگی۔ "او گڑیا کی بچی' بھوک نہیں لگی تمہیں؟ کیا منہ اٹھائے یہیں جم گئی ہو' بھاگو اندر" بالآخر عاصم بھائی نے جھلا کر کہا تو میں ہنستی ہوئی اندر آگئی۔ ابھی امی نے میری پلیٹ میں چاول نکالے ہی تھے کہ عاصم بھائی کی آواز آئی۔ وہ منٹو کو سخت سست کہہ رہے تھے۔ میں چمچ ہاتھ میں پکڑے باہر بھاگی۔ پیچھے پیچھے دادی جان بھی اپنی چھڑی سمیت آگئیں۔ باہر آکر معلوم ہوا کہ منٹو جو کچھ دیر پہلے منظر عام سے غائب تھا نجانے کہاں سے کیچڑ میں لت

پت نمودار ہوا اور تازہ تازہ روغن شدہ چوکی پر چپک کر بیٹھ گیا۔ بھائی جان نے اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ کمال شان بے نیازی سے وہیں جم کر بیٹھا رہا۔ یہ صورت حال دیکھ کر دادی جان تلملا کر اٹھیں اور اپنی چھڑی سے منٹو کو کچوکا۔

منٹو نے آنکھیں کھول کر بڑے اسٹائل سے انہیں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو "ہائیں بڑی بی! میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے" اس کی ڈھٹائی دیکھ کر دادی جان نے اس پر چھڑی سے وار کیا تو وہ چھلانگ لگا کر دیوار کے پار بھاگ گیا اور میں منٹو کی بدتمیزی پر شرمندہ اور دادی جان کے رویے پر رنجیدہ ہو کر اندر آ گئی۔

"اب اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا!" دادی جان کھانے کی میز پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیا بندوبست؟" میرے منہ سے بے اختیار بوکھلاہٹ میں نکلا، لیکن میری بات کا دادی جان نے کوئی جواب نہ دیا اور صرف غصے سے گھورا تو میں سر جھکا کر رہ گئی۔ دادی جان کی چھڑی کھانے کے بعد منٹو دو دن تک نظر نہ آیا۔ اس صورت حال سے میں سخت پریشانی کا شکار ہو گئی۔ "کہیں مر ہی نہ گیا ہو؟ دادی جان کی چھڑی ہے بھی تو کتنی موٹی! ہائے اس نے مرتے وقت مجھے کتنی بددعائیں دی ہوں گی؟" اپنے انہیں اندوہ ناک خیالات کا اظہار جب میں نے بھائی جان سے کیا تو وہ بولے "ارے اتنی زور سے تو نہیں مارا تھا دادی جان نے! تمہیں نہیں معلوم یہ بلیاں کہاں کہاں آوارہ گردی کرتی رہتی ہیں لیکن واپس ضرور آجاتی ہیں"۔

لیکن بھائی جان کی بات سے میری تسلی نہ ہوئی اور میں اسکول میں تیسرے دن بھی اداس رہی۔ تیسرے دن جب میں اسکول سے واپس گھر پہنچی تو امی، دادی، بھائی اور ماسی سبھی پچھلے باغ میں لگے ٹیوب ویل کے گرد موجود تھے۔ ٹیوب ویل کا کشتی نما ڈھکن کھلا ہوا تھا اور ویل میں سے منٹو کی میاؤں میاؤں سنائی دے رہی تھی۔ "منٹو اندر ہے؟" میں نے سٹ پٹا کر پوچھا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ "اسے باہر نکالیں، ہائے بھائی پلیز کچھ کریں نا!" میں نے بے قراری سے کہا۔

"کر رہے ہیں، کر رہے ہیں، کوشش تو کر رہا ہے وہ بے

چارا!" دادی جان نے مجھے ڈپٹا۔

ٹیوب ویل میں اترنا بھائی کے بس کا کام نہ تھا۔ لہٰذا وہ ایک مزدور کو بلا لائے جو رسی کی ایک لمبی سیڑھی کی مدد سے نیچے اترا۔ کوئی 25 منٹ بعد وہ مزدور منٹو کو ہاتھوں میں اٹھائے باہر آیا۔ منٹو صاحب کافی وحشت زدہ ہونے کی وجہ سے خاموشی سے مزدور کی گود سے اتر آئے۔ میں نے لپک کر منٹو کو اٹھا لیا۔ "توبہ کیسی کیسی مصیبت لاتا ہے یہ کالا جانور۔ کرتی ہوں اب اس کا کوئی بندوبست!" دادی جان نے ایک مرتبہ پھر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

میں نے دکھ سے دادی جان کی طرف دیکھا' لیکن فوراً ہی امی کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ منٹو کے پیالے میں دودھ ڈالنے کے بعد مجھے بلا رہی تھیں۔ میں شام گئے تک منٹو کو گود میں لیے بیٹھی رہی "اگر آج میرے منٹو کو کچھ ہو جاتا تو.....؟" میں بار بار پریشان ہو کر سوچتی۔ لیکن منٹو ٹیوب ویل میں پہنچا کیسے؟ یہ بات نہ تو منٹو مجھے بتا سکتا تھا اور نہ ہی میں آئندہ اسے ایسا کرنے سے روک سکتی تھی۔ کچھ دیر تو مجھے یہ بات بھی پریشان کرتی رہی کہ آخر دادی جان منٹو کا کیا بندوبست کرنا چاہتی ہیں' لیکن جب اگلے دو دن خیر خیریت سے گزر گئے تو میں مطمئن ہو گئی۔ لیکن خیر کے یہ لمحات بہت کم تھے۔ کیوں کہ تیسرے ہی دن جب میں اسکول سے گھر پہنچی تو دادی جان کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ میں ایک دم دبک گئی۔ کیوں کہ دادی جان کی پر جلال آواز میں بار بار کالی بد روح کا ذکر تھا۔ پہلے تو میں سہمی سی کھڑی رہی' پھر کپڑے دھونے والی ماسی سے تمام ماجرا جاننے اس کے پاس غسل خانے میں چلی گئی۔

وہ بولی "آج تمہارے منٹو نے باورچی خانے میں جا کر ہانڈی الٹ دی" اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بتاتی' دادی جان نے گرج دار آواز میں مجھے پکارا "ادھر آؤ گڑیا! یہ دیکھو تمہارے لاڈلے نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟"

میں سہمی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ یہاں فرش پر مٹی کی ہنڈیا ٹوٹی پڑی تھی اور وہ شب دیگ جو دادی جان نے دو دن کی محنت سے بنائی تھی زمین پر بکھری ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے۔ منٹو کو! کیوں اتنی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا ہے؟ میں ابھی پریشانی میں منٹو کو ڈھونڈ رہی تھی جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا کہ دادی جان کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا "عاصم' جونہی وہ بد روح نظر آئے' پکڑ کر فوراً بوری میں بند کر لینا"۔ دادی جان نے حکم دیا "بوری میں!" میرے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"ہاں تاکہ اسے کہیں دور چھوڑ کے آیا جا سکے" دادی جان نے بہت اطمینان سے اپنی بات مکمل کی لیکن میری روح فنا ہو گئی۔ تو کیا میرا منٹو کہیں دور چلا جائے گا۔ اللہ کرے منٹو عاصم بھائی کے ہاتھ لگے ہی نہ' میں بہت دیر تک یہ دعا مانگتی رہی۔ شام کو میں ڈگ مگاتے قدموں کے ساتھ امی کے پاس باورچی خانے میں پہنچی۔ چچا جان اور ابو بھی وہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ "امی منٹو تو نہیں آیا نا" میں نے سلام کرنے کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!" امی نے قدرے سرد لہجے میں مختصر جواب دیا۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی باغ میں آ گئی۔ اسی وقت نجانے کہاں سے آوارہ گرد منٹو آن پہنچا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا اور پیار کرنے لگی۔ مجھے دراصل یہ فکر تھی کہ گھر کا کوئی اور فرد اسے نہ دیکھ لے۔ میں اسے چھپانے کو جگہ سوچنے لگی لیکن تقریباً ایک فٹ اونچے' ریشم سے چمک دار بالوں والے منٹو کو چھپانا آسان کام نہ تھا۔ میں ابھی کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ عاصم بھائی ہاتھ میں بوری لیے بھاگے چلے آئے۔ "شاباش گڑیا' اسے قابو کیے رکھو میں بوری کھولتا ہوں" وہ بوری کی تہیں نکالتے ہوئے بولے۔

"جی؟" میں بوکھلا گئی۔

"اوہو! بے وقوف میں بوری کا منہ کھولوں گا' تم اسے اندر پھینک دینا" انہوں نے جھلا کر کہا۔

"یار! یہ کام گڑیا کے بس کا نہیں! لاؤ بیٹے!" بھائی جان کے پیچھے پیچھے آنے والے چچا جان نے منٹو کو باقاعدہ میرے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی منٹو نے ٹانگیں چلانا شروع کر دیں اور انتہائی دردناک انداز میں میاؤں میاؤں کرنے لگا۔ جیسے مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ میرا دل جیسے بند ہو گیا ہو۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی اور خاموش تماشائی بنی رہی۔ منٹو کو بوری میں ڈال کر بوری کا منہ بند کر دیا گیا اور بوری گاڑی کی ڈگی میں رکھ دی گئی۔ "بھائی! پلیز اسے نہ لے کر جائیں" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں گڑیا! دادی جان بہت خفا ہیں" بھائی نے بے چارگی سے کہا۔ ساتھ ہی چچا جان نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں روتی روتی اندر آگئی اور بستر پر گر کر پھر سے رونے لگی۔ "ہونہہ کتنی ظالم ہیں دادی جان! ہائے منٹو کیا کرے گا؟ کہاں سوئے گا؟ کیا کھائے گا؟ نجانے اسے کہاں چھوڑ آئیں گے؟" میں آخر روتے روتے رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ میرا اسکول جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' دل اتنا اداس تھا کہ آنسو خود بخود آنکھوں سے بہنے لگتے۔ ناشتے کی میز پر میں نے دیکھا کہ عاصم بھائی بھی خاموش بیٹھے تھے۔ وہ یقیناً اپنی کل کی کارگزاری پر شرمندہ تھے۔ "گڑیا! کیا بات ہے؟" مجھے گم سم دیکھ کر ابو نے میرا ماتھا چھوا۔ پھر بولے "اوہو تمہیں تو شاید ہلکا سا بخار بھی ہے۔ چلو اب آگے دو چھٹیاں آگئی ہیں آرام کرنا۔ اسکول کی پڑھائی تو اس دن جیسے تیسے ہو گئی لیکن گھر آکر کھانا زہر مار کرنا ناممکن تھا۔ امی نے بھی کھانے پر زیادہ اصرار نہ کیا اور مجھے بستر میں لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد عاصم بھائی آگئے۔

"کیا کر رہی ہو گڑیا؟" انہوں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے دبے سے لہجے میں پوچھا۔

"بھائی کچھ نہیں؟" میری آنکھیں پھر سے ڈبڈبانے لگیں۔

"بھائی منٹو کو کہاں چھوڑ کر آئے ہیں؟" میں بے اختیار بھائی سے لپٹ کر رونے لگی۔

"گڑیا چاند! میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں' منٹو بالکل ٹھیک جگہ پر ہے' وہ جو فیکٹریوں کے پاس گوشت کا بازار ہے وہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ تم بے فکر رہو' وہ وہاں بہت عیش کرے گا" بھائی نے مجھے پیار کرتے ہوئے تسلی دی۔ لیکن میرا دل بجھا ہی رہا۔ رات کے کھانے پر دادی جان میرے بالکل سامنے بیٹھی تھیں۔ میں خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ اچانک میری نظر ان کی نظر سے ملی تو میری آنکھیں پھر سے ڈبڈبانے لگیں۔ آنسو پی کر جب میں نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا تو وہ مسلسل میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پھر سر جھکا لیا اور سوچنے لگی "یہ کیا ہو گیا تھا دادی جان کو؟ وہ تو ہر کسی سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں! پھر منٹو کو کیوں بھیج دیا انہوں نے"۔ اچانک دادی جان کی آواز ابھری "بھئی بچوں کے ٹسٹ تو ختم ہو گئے ہیں؟"

"جی بالکل!" امی نے مسکرا کر بتایا۔

"تو پھر انہیں ایک دو دن کے لیے مری لے جاؤ' کیوں کیا خیال ہے؟" دادی جان نے بات مکمل کی

"خیال تو بہت اچھا ہے' مجھے بھی دفتر سے ہفتے اتوار کی چھٹی ہے۔ بس صبح ہی چلتے ہیں؟" ابو نے جوش سے کہا۔ امی اور بھائی نے بھی تائید کی۔ میں خاموش رہی۔

"اچھا میں ذرا کل کی کچھ تیاری کر لوں!" امی جلدی جلدی برتن اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"اماں آپ خود بھی چلیں گی ناں؟" امی نے باہر جاتے جاتے محبت سے پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی! تم لوگ جاؤ" دادی جان اطمینان سے بولیں۔

"مگر ہم آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟" امی دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"بھئی میں کوئی بچی تو نہیں، نہ ہی بیمار ہوں، تم سب سے زیادہ حوصلے والی ہوں" دادی جان اطمینان سے کہنے لگیں تو امی اور ابو نے ان سے مزید بحث نہ کی۔ امی کا خیال تھا کہ دادی جان یا تو دو روز کے لیے چچا جان کے گھر چلی جائیں یا ان کے گھر سے کوئی دادی جان کے پاس آجائے۔ لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئیں۔

پھر اگلی صبح ہم لوگ مری کے لیے روانہ ہوئے۔ اب میرا خیال بھی خاصا بٹ گیا تھا اور میں بھی سیر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اگلے روز کی پہلی پرواز سے واپس آنا تھا لیکن دھند کے باعث جہاز اڑ ہی نہ سکا۔ ہمیں واپس ہوٹل چھوڑ کر ابو پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے گھر فون کرنے لگے۔ ابھی دوپہر ہی کو تو امی کی دادی جان سے بات ہوئی تھی، اب کوئی فون اٹھا ہی نہ رہا تھا۔ تنگ آکر ابو نے چچا جان کو فون کیا "فکر نہ کریں بھائی جان، میں خود جا کر پتا کرتا ہوں۔ پھر آپ کو اطلاع دوں گا" چچا جان نے ابو کو تسلی دی۔

ابو بے چینی سے بہت دیر تک چچا جان کے فون کا انتظار کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ہم سب بھی اپنی جگہ پریشان ہوتے رہے۔ "اللہ میاں دادی جان خیریت سے ہوں، نہ وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھتیں اور نہ ہمیں مری کی سیر کو بھیجتیں۔ کیا ہوا جو انہوں نے منٹو کو بھیج دیا" میں پریشانی سے سوچتی رہی۔

اس دن دھند اور بارش کی وجہ سے کوئی پرواز روانہ نہ ہوئی۔ اگلے روز جب پہلا جہاز اڑا تو ہم بھی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں اور بھائی دادی جان کو پکارتے ہوئے اندر بھاگے۔

"ارے بچو آگئے" اطمینان سے کتاب پڑھتی دادی جان نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

"اماں کیا فون خراب ہے؟" ابو نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، تمہیں تو پتا ہے۔ ذرا سی بارش ہو تو لائن بند ہو جاتی ہے!" دادی اماں نے مسکرا کر کہا۔

میں اب بھی دادی کے ساتھ چپکی کھڑی تھی کہ اچانک میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ دروازے کے پاس ایک ٹوٹے پرانے کے اوپر منٹو براجمان تھا۔

"منٹو!" میری چیخ نکلی اور میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔

"یہ یہ کہاں سے واپس آیا!" بھائی کی پھسی پھسی آواز آئی۔ امی ابو بھی حیرت زدہ سے کھڑے تھے۔ "ہائے پتا نہیں بے چارا کہاں سے چل کر گھر پہنچا ہے۔ کل سے آٹھ مرتبہ دودھ ڈال چکی ہوں" دادی جان اپنائیت سے بھرپور لہجے میں بولیں۔

"مگر یہ کب اور کیسے آیا؟" امی جان ان کے ناقابل یقین رویے سے متاثر ہو کر بولیں۔

"تم لوگوں کو بھیج کر میں تو بالکل اکیلی اور اداس ہو گئی تھی۔ بس دوپہر کو بستر پر لیٹی تھی کہ اس کی مریل سی میاؤں میاؤں سنائی دی۔ سچ رحمت بن کر واپس آیا ہے ہمارا منٹو تو، بس یہ آیا تو سارا اکیلا پن، ساری اداسی دور ہو گئی۔ میں تو کتنی ہی دیر اس سے باتیں کرتی رہی۔ تمہیں تو معلوم ہے بلی اپنا گھر کبھی نہیں چھوڑتی۔ اسے اپنے ٹھکانے سے بہت محبت ہوتی ہے۔ سو منٹو بھی اپنے گھر واپس آگیا!" دادی جان نے میری گود میں بیٹھے منٹو کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ اور اب آپ لوگوں کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ اس کے بعد سے سب لوگ منٹو کو منٹو ہی پکارتے ہیں۔

بخدمت جناب ایڈیٹر

آپ کا خط ملا

اپریل کا تعلیم و تربیت اپنی تعریف آپ تھا۔ ماں کا بھروسہ اور ایک قابل تقلید ماں بے حد پسند آئیں (یاسر اقبال راول پنڈی)

اس مہینے کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ ہائی را اور مامتا اور ماں کا بھروسہ بہت پسند آئیں (اسامہ جلیل چکوال)

سچی کہانی کا سلسلہ ہمیں بہت پسند آیا ہے۔ سائنس فکشن کا سلسلہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ آپ نے ناول شروع کرنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ اب تو ہمارے امتحانوں کا رزلٹ بھی آگیا ہے (اسما جلال پور)

اس دفعہ سب کہانیاں اچھی تھیں مگر ہائی را اور مامتا سب سے زیادہ اچھی لگی۔ کارٹون کہانی پڑھ کر مزہ آگیا (محمد راشد خان جہلم)

اتنا خوب صورت شمارہ شائع کرنے پر تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو مبارک باد۔ یہ واقعی ایک یادگار شمارہ ہے۔ کہانیاں ماں کا بھروسہ، بہترین دوست، مامتا کا کرشمہ سپرہٹ رہیں۔ ایک قابل تقلید ماں بھی اچھی تھی (مبشر عزیز، مصباح نورین کالا گوجراں)

اپریل کا چمکتا دمکتا تعلیم و تربیت ملا۔ ماں نمبر سے آپ نے ثابت کر دیا کہ تعلیم و تربیت بچوں کا بہترین رسالہ ہے۔ انکل پلیز اقوال زریں کا سلسلہ شروع کریں (رفعت راجہ راول پنڈی)

اپریل کا سرورق اتنا اچھا نہ تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر ایک قابل تقلید ماں، ہائی را اور مامتا، مامتا کا کرشمہ اور دو مائیں دو بیٹے بہت زبردست تھیں (شمائلہ حاجی محمد گوجرانوالہ)

کہانیوں میں عہد، انوکھی خواہش، بہترین دوست، مامتا کا کرشمہ بہت پسند آئیں۔ ایک قابل تقلید ماں بہت اچھی تحریر تھی۔ محمد وقاص زیب، مانسہرہ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ بہرحال انہوں نے دیکھ لیا ہو گا کہ ان کا تنقید بھرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ وہ سوچتے ہیں (طیبہ محمود گوہر لاہور چھاؤنی)

آپ نے تعلیم و تربیت میں اچھی تبدیلیاں کی ہیں۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ سرورق بہت خوب صورت تھا (محمد حسیب احسن فیصل آباد)

کہانیاں سب اچھی تھیں۔ ملا نصرالدین اور ماں کی نافرمانی کی سزا بھی بہت پسند آئی (فرحان عباسی راول پنڈی)

اپریل کا تعلیم و تربیت بہت دل چسپ تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر ماں کا بھروسہ، بہترین دوست، انوکھی خواہش اور ایک قابل تقلید ماں بہترین تھیں۔ میں آپ کی توجہ ایک غلطی کی طرف دلانا چاہتی ہوں۔ آخری لطیفے میں لفظ "طوطا" ت (توتا) سے لکھا گیا ہے (انیقہ بانو اسلام آباد)

☆ صحیح لفظ "توتا" ہی ہے۔ اڈیٹر

"ماں نمبر" واقعی ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا۔ "ماں نمبر" ماں کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ آپ اب "باپ نمبر" بھی شائع کریں (سدرہ زاہد لاہور)

ہمیں آپ کا رسالہ بہت پسند ہے۔ ہو سکے تو اسے ہفت روزہ بنا دیں (زعیم امان، زعیمہ امان، تحریمہ امان لاہور)

سرورق دیکھ کر دل اش اش کر اٹھا۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ لیکن دو مائیں دو بیٹے اور بہترین دوست نے زیادہ متاثر کیا (شاہد اقبال مخدوم پور پہوڑاں)

ماں نمبر تو ہماری توقعات سے بھی بڑھ کر ہے۔ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو مات دے رہی ہیں (روما محمود راول پنڈی)

"ماں نمبر" کا تو بے حد مزا آیا۔ شرارتی لکیریں پڑھ کر ہم لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک قابل تقلید ماں پڑھ کر آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے (علی اختر بہاول نگر)

دل چسپ اور ناقابل یقین کا سلسلہ بہت مزے دار ہے۔ اسے اسی طرح جاری رہنا چاہئے۔ "کھیلوں کی دنیا" میں تازہ ترین صورت حال پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے (شاہد علی نارووال)

اپریل کا تعلیم و تربیت واقعی ایک یادگار شمارہ ہے۔ اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارک باد۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، خاص طور پر ایک قابل تقلید ماں تو بے حد پسند آئی (نایاب طالب حیدر آباد)

اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارک باد قبول کیجئے۔ اس ماہ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لطیفے کارٹون اور شرارتی لکیریں بھی اچھی تھیں۔ نظموں میں ماں کا پیار اور ماں کا سایہ بہت پسند آئیں۔ مجاہدین آزادی کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے پر بہت خوشی ہوئی۔ رسالے کا معیار دن بدن بڑھ رہا ہے (علی رحمان فیصل آباد)

آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ان تھک کوششوں نے ماں نمبر کو واقعی چار چاند لگا دیے۔ اس شان دار کام یابی پر آپ کو میری طرف سے دلی مبارک باد۔ خدا کرے تعلیم و تربیت ہمیشہ اسی طرح کام یابیوں کے زینے چڑھتا رہے (فاخرہ رشید راول پنڈی)

ماں نمبر میں سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن جو کہانیاں ہمیں بہت زیادہ پسند آئیں ان میں ماں کا بھروسہ، بہترین دوست، انوکھی خواہش، عہد اور ایک قابل تقلید ماں شامل ہیں۔ نظموں میں "ماں" بہت پسند آئی (محمد سلمان رؤف لاہور)

تعلیم و تربیت پڑھ کر بڑا مزہ آیا مگر سارا مزہ اس وقت خراب ہو گیا جب "محمد وقاص زیب مانسہرہ" نے اپنے خط میں ہمارے اتنے پیارے رسالے پر غلط قسم کی تنقید کی۔ بے شک تنقید کرنا ہر کسی کا حق ہے مگر اس حق کا غلط استعمال نہیں کرنا چاہئے (یاسر فضل لاہور)

میں تین مہینوں سے تعلیم و تربیت نہیں پڑھ سکا کیوں کہ رمضان المبارک میں میرے والد صاحب انتقال کر گئے تھے (جبران بشیر لاہور)

☆ ہمیں آپ کے والد محترم کی وفات پر دلی افسوس ہوا ہے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔

واقعی آپ "ماں نمبر" کو ایک یادگار شمارہ بنانے میں کام یاب ہو گئے ہیں۔ سرورق لاجواب تھا۔ کہانیوں میں ماں کا بھروسہ، ایک قابل تقلید ماں اور بہترین دوست بہت پسند آئیں (ذیشان سعید بٹ سرگودھا)

اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی۔ نیا سلسلہ "سچی کہانی" بھی بہت پسند آیا۔ (ارم سلیم، بشریٰ وحید سیال کوٹ)

ماں نمبر کو اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ نے ہمیں ماں نمبر کی صورت میں عید کا تحفہ دیا ہے۔ اب پاس ہونے کی خوشی میں ناول بھی شروع کر دیں ناں (محمد حسان طارق ساہی وال)

اپریل کا شمارہ واقعی یادگار تھا۔ تمام کہانیاں، نظمیں، لطائف اور دوسرے سلسلے اچھے تھے۔ محمد وقاص نے جو تعلیم و تربیت پر تنقید کی ہے وہ ہم سب پڑھنے والوں کو پسند نہیں آئی۔ ویسے انہوں نے خط شائع کروانے کا اچھا طریقہ سوچا ہے (نائلہ کیانی راول پنڈی)

تعلیم و تربیت کا معیار پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر کھیلوں کی دنیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں ثقلین مشتاق، معین خان اور عامر سہیل کا تعارف بھی شائع کریں (زیبا اکرم لاہور)

ماں نمبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں ماں کا بھروسہ، احساس اور مامتا کا کرشمہ پسند آئیں۔ قابل تقلید ماں تو بہت ہی اچھی لگی (امتیاز فرید ملک بہاول پور)

ماں نمبر بہت اچھا لگا۔ واقعی ماں اللہ کی بے حد خوب صورت تخلیق ہے۔ ساری ہی کہانیاں بہت اچھی تھیں خاص طور پر ایک قابل تقلید ماں اور بہترین دوست بہت پسند آئیں (اویس زاہد لاہور چھاؤنی)

اپریل کا تعلیم و تربیت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ٹائٹل پر بنی ہوئی بی اماں کی تصویر بہت خوب تھی۔ کسی بھی کہانی کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہو گی لیکن دو مائیں دو بیٹے، انوکھی خواہش، بہترین دوست اور نئی امی بہت ہی ونڈر فل تھیں۔ اس دفعہ آپ نے کا سلسلہ "سچی کہانی" شروع کر کے ہمارے علاوہ دوسرے تمام ساتھیوں کے بھی یقیناً دل موہ لئے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب صاحب نے مضمون "ایک قابل تقلید ماں" لکھ کر علی برادران اور پاکستانی قوم کی عظیم ماں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے (خلیل احمد ملک فیصل آباد)

"ماں نمبر" دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اتنا زبردست نمبر نکالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ البتہ "پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں" سلسلہ نہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کیوں کہ یہ میرا فیورٹ سلسلہ ہے (عنبرین نصر قریشی پشاور صدر)

واقعی "ماں نمبر" اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ نیا سلسلہ سچی کہانی پسند آیا (فہد اکرم فیصل آباد)

سرورق جاذب نظر تھا، کہانیوں میں بہترین دوست، عہد اور ایک قابل تقلید ماں پسند آئیں (جہانزیب خان شیخوپورہ)

دسمبر جنوری اور مارچ کے شماروں میں محمد مدثر حسن جلال پور پیر والہ، محمد ندیم شہزاد علی پور چٹھہ اور اشتیاق محمود رکھی نے اپنے اپنے خطوط میں گزارش کی تھی کہ آپ ہر ماہ کسی نہ کسی کھلاڑی کا انٹرویو دیا کریں۔ میں نے بھی کئی بار آپ کو خط لکھا مگر میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔ براہ کرم ہم سب کی یہ گزارش قبول کریں (بینش عارف لاہور)

ماں کے پرنور چہرے سے چمکتا ہوا اپریل کا تعلیم و تربیت ملا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ نظم ماں کا پیار بھی اچھی تھی (اثمارہ ارشد لاہور)

"ماں نمبر" یکم اپریل کو ہی مل گیا اور پلک جھپکتے ہی سارا پڑھ ڈالا۔ ساری کہانیاں اچھی اور سبق آموز تھیں مگر بہترین دوست اور ایک قابل تقلید ماں سب پر بازی لے گئیں (عائشہ نورین راول پنڈی)

بلاشبہ "ماں نمبر" ایک بہترین اور یادگار شمارہ تھا۔ سرورق بے حد خوب صورت تھا۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس شمارے کو پڑھ کر ہم نے اپنے آپ سے یہ عہد کر لیا ہے کہ ہمیشہ اپنی امی جان کا کہنا مانیں گے (مہوش امین لیاقت پور)

اس مرتبہ سرورق بہت پسند آیا۔ مجاہدین آزادی کو اپنے درمیان

پاکر بہت خوشی ہوئی۔ خطوط میں محمد وقاص زیب مانسہرہ کا خط پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ نہیں پسند آتا تو نہ پڑھیں یوں دل تو نہ دکھائیں' ان لاکھوں قارئین کا جو بڑے شوق سے رسالہ پڑھتے ہیں (حسن اکبر پپلاں)

ماں نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ سچی کہانی کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ ہمیں بہت پسند آیا ہے۔ آخر آپ مجرم کون؟ کا سلسلہ کیوں نہیں شروع کرتے (چودھری محمد امتنان الرحمٰن چاہل فیصل آباد)

میں تعلیم و تربیت کا پرانا قاری ہوں۔ مجھے تعلیم و تربیت آج بھی بہت پسند ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس میں صرف ایک کمی ہے کہ علمی آزمائش میں سوالات نہیں ہوتے۔ سوالات سے کم از کم معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہے' انعام نہیں ملتا تو نہ سہی۔ نیز آپ ہر ماہ کسی بھی کھلاڑی کا تازہ ترین انٹرویو شائع کیا کریں (حافظ نعیم احمد جھنگ)

پتا نہیں آپ کے تعلیم و تربیت نے کیا جادو کر دیا ہے کہ میں اس کا کوئی بھی شمارہ مس نہیں کرتا اور اسے باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ اب آپ قسط وار کہانی بھی شروع کر دیں (سلمان محمود سلطان)

ماں نمبر تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ کہانیوں میں نعیم احمد بلوچ صاحب کی ماں کا بھروسہ' سید نظر زیدی صاحب کی دو مائیں دو بیٹے' نجمہ معراج صاحبہ کی احساس' ڈاکٹر رضوان ثاقب صاحب کا مضمون ایک قابل تقلید ماں اور سلیم خان گمی صاحب کا ڈرامہ "نئی امی" بہت پسند آئے۔ بلاشبہ تعلیم و تربیت پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ ہے (ماجد خان جمالی کراچی)

میں غالباً 1957ء سے تعلیم و تربیت کی قاریہ ہوں۔ میرے بچپن کے دنوں میں ایک شمارے میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا منظوم واقعہ شائع ہوا تھا۔ جس میں چوروں کے سردار نے حضرت کی سچائی اور والدہ کی فرماں برداری سے متاثر ہو کر توبہ کی تھی۔ اس کا ایک شعر ابھی تک مجھے یاد ہے۔

سنی بات چالیس دینار کی.... ٹپکنے لگی رال سردار کی

پھر اس کا مطالعہ چھوٹ گیا اور جب میرے بچوں نے پڑھنا شروع کیا تو تعلیم تربیت اپنا ٹائٹل اور سائز بدل کر ہمارے گھر آیا۔ بچے اسکول چلے جاتے تو میں پورا رسالہ پڑھ لیتی۔ بچوں کے امتحانات کے دنوں میں ان کے ابو جی ان کی غیر نصابی سرگرمیاں ختم کروا دیتے۔ میں رسالہ منگوا کر' چھپا کر رکھ دیتی۔ بچے فارغ ہو کر رسالہ دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ مجھے اس کی کہانیاں بہت پسند ہیں اور نظمیں بھی (ام شافعیہ اٹک)

ماں نمبر بہت پسند آیا۔ یقین کیجئے اتنا اچھا شمارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ اس دفعہ دل چسپ اور ناقابل یقین اور کھیلوں کی دنیا جیسے اچھے سلسلے نہ پاکر تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی مگر "ماں نمبر" کی خوشی میں ہم یہ بھی بھول گئے (ندیم رزاق طور)

اس ماہ کا سارا شمارہ اچھا تھا۔ قسط وار کہانی جلد از جلد شروع کریں اور بلاعنوان کی جگہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (عامر انصاری باغ جھنگ)

اپریل کے شمارے کے سرورق پر ماں کی خوب صورت تصویر دیکھ کر دلی تسکین محسوس ہوئی۔ ماں نمبر میں تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر ماں کا بھروسہ' ہائی را اور مامتا' مامتا کا کرشمہ' دو مائیں' دو بیٹے اور عہد اچھی لگیں۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کے مضمون ایک قابل تقلید ماں نے بہت متاثر کیا (ظہر عباس سوتراچنیوٹ)

اپریل کا تعلیم و تربیت اپنی مثال آپ تھا۔ سرورق بہت ہی شان دار تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص کر عہد' انوکھی خواہش' مامتا کا کرشمہ اور ہائی را اور مامتا سب پر سبقت لے گئیں (صائمہ جہان ہنگو)

اس مرتبہ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کارٹون کہانی بھی اچھی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دل چسپ اور ناقابل یقین اور کھیلوں کی دنیا شائع نہیں ہوئے (عمر عمران بہاول پور)

☆ اداریے میں وضاحت کر دی گئی تھی کہ یہ سلسلے ماں نمبر کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہے (اڈیٹر)

ماں نمبر بے حد پسند آیا۔ اتنا پسند آیا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر ایک قابل تقلید ماں تحریر مجھے بے حد پسند آئی۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی تھیں (فوزیہ رانی راول پنڈی)

اس دفعہ ماں نمبر پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا ہے۔ ایک گزارش ہے کہ اب بہن نمبر بھی نکالیں (رباب ظفر لاہور)

ماں نمبر ہر لحاظ سے عمدہ اور بے مثال تھا۔ اتنا عظیم شمارہ شائع کرنے پر تمام عملہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ کہانیوں میں بہترین دوست زیادہ پسند آئی (ملک ثاقب محمود کھاریاں)

دیار غیر میں رہتے ہوئے وطن کی یاد بہت آتی ہے اور جب کبھی پاکستان یاد آئے تو ہمیشہ تعلیم و تربیت کی یاد بھی آتی ہے۔ ہم لوگ اس کو لندن میں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں (محمد کاشف صدیق' شور کوٹ چھاؤنی)

ماں نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ انکل' کیا یہ بی اماں کی اصلی تصویر ہے (محمد عاصم خبیب' ملتان)

☆ جی ہاں یہ بی اماں کی اصلی تصویر ہے جو ہمیں ان کے خاندان کے چشم و چراغ محترم شاہد بابر صاحب نے دی ہے۔ ہم اس تعاون پر ان کے شکر گزار ہیں۔ اڈیٹر

ہونہار مصور

قربانی کا جانور

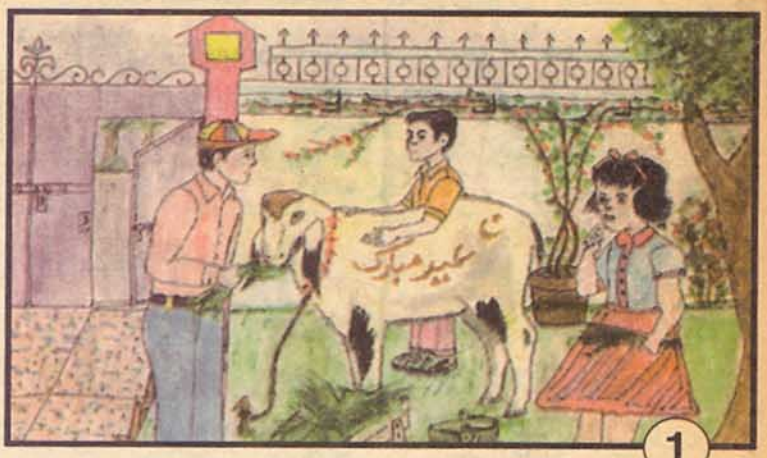

1

رضوان علی شاہ، جھنگ صدر (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

2

علی زہیر نعمانی، اسلام آباد (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

3

ابراہیم مجددی، کوئٹہ (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

4

قرۃ العین زہرا، ملتان (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

5

سید زہیر رضوی، لاہور (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6

سعدیہ یاسمین، منڈی بہاء الدین (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: ارم بتول چشمہ بیراج۔ افضل سراج اوکاڑہ۔ زاہدہ پروین کراچی۔ عبدالحنان لاہور۔ محمد نوید جیلانی کراچی۔ شمائلہ ضیاء ہاشمی کمر مشانی۔ میمونہ فاروق راول پنڈی۔ المطرہ فرناز آواگت۔ ارم گل کوٹلہ جام۔ سدرہ جاوید لاہور۔ حنا لطیف لاہور۔ حافظ محمد مسعود الرحمان جھاوریاں۔ ظفر اقبال سٹھو چک نمبر 15/8.BR۔ محمد آصف لاہور۔ فاطمہ وقار لاہور۔ راشد حسن فیصل آباد۔ فروہ تصدق لاہور۔ سیدہ نور العین زاہدی میرپور۔ حنا فاروق فیصل آباد۔ زین العابدین خان اسلام آباد۔ محمد بلال الدین اسلام آباد۔ محمد علی کامران ملتان۔ حماد حنیف چنیوٹ۔ امجد علی جہلم۔ رقیہ رفیق لاہور چھاؤنی۔ مصباح منصور لاہور۔ سعدیہ نعیم قریشی مانسہرہ۔ رانا محمد عابد رفیق فیصل آباد۔ کنول ایاز ایبٹ آباد۔ اصغر علی انصاری چک نمبر 59 ای بی عارف والا۔ رائے عدنان منیر شیخوپورہ۔ انعم انجم لاہور۔ مبشرہ اقبال سرگودھا۔ فائزہ سید محسن رضا ترمذی جھنگ۔ مسرت نورین خانیوال۔ انیلہ کیانی راول پنڈی۔ علی حسنین خرم ملتان۔

ہدایات: تصویر 16 انچ چوڑی، 19 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جون کا موضوع: کھیل کا میدان — آخری تاریخ 7 مئی

جولائی کا موضوع: مچھلی کا شکار — آخری تاریخ 7 جون

خدا نے یہ کیا شے بنائی ہے مچھر
دہائی دہائی دہائی ہے، مچھر
کھلے صحن میں یہ مرے اڑ رہا ہے
ادھر مڑ رہا ہے، ادھر مڑ رہا ہے
یہ کاٹے مجھے اور مرا خون چوسے
کہ ہے زندگی اس کی میرے لہو سے
نہ پیدا کرے یہ ذرا سی بھی آہٹ
مرے کان میں ہے یہ کیا بھنبھناہٹ
میں بچو، نیا شعر جب کوئی سوچوں
نئی نظم جب کوئی لکھنے کو بیٹھوں
یہ چپکے سے آکر مجھے کاٹ کھائے
میں لکھوں اگر کچھ تو لکھا نہ جائے
کرشمہ ہے یہ شہر کی گندگی کا
بڑا جان لیوا ہے ننھا سا کیڑا

ضیغم حمیدی

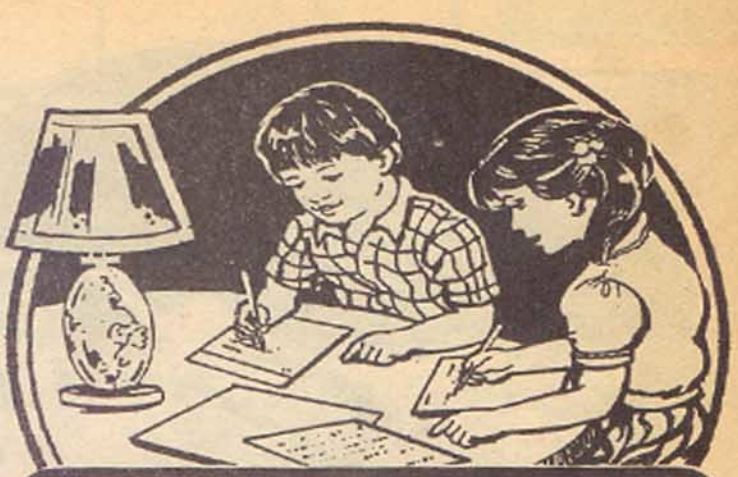

آپ بھی لکھیے

فائنل میچ

ساجدہ غلام محمد، کراچی

وہ ٹی وی روم میں داخل ہوا لیکن دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔ سامنے صوفے پر ابو بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ "ابو جی!" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"جی بیٹا! کیا بات ہے؟" ابو نے اخبار پر سے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

ایک لمحے کو ٹھہرا پھر ہمت کر کے بولا "ابو جی! وہ پیسے چاہیں"۔ جس کے جواب میں ابو نے اسے گھورا اور پھر اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

"ہمارا میچ ہے آج جو ٹیم جیتے گی، مخالف ٹیم اسے مٹھائی کھلائے گی" علی نے وہی پرانا موقف استعمال کیا۔

"یہ کیا تمہارے ہر ہفتے میچ ہو رہے ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے تو لے کر گئے تھے تم، پورے 500 روپے۔ وہ کہاں گئے؟"

"وہ تو خرچ بھی ہو گئے۔ پچھلے ہفتے ہم میچ ہار گئے تھے"۔

"کبھی پڑھائی پر بھی توجہ دے لیا کرو۔ اس بار دیکھا ہے نا تم نے تمہاری رپورٹ کتنی خراب آئی ہے۔ خیر میں اس مرتبہ دے رہا ہوں مگر آئندہ مجھ سے نہ مانگنا" ابو پیسے دیتے ہوئے بولے۔

علی نے دل میں شکر ادا کیا اور جلدی سے پیسے لے کر چلا گیا کہ ابو اپنی نصیحتوں کی پٹاری نہ کھول دیں۔

"اف کیا بنے گا اس لڑکے کا؟" علی کے جانے کے بعد اس کے ابو بڑبڑائے۔

"کیا ہوا بھائی جان؟ پریشان لگ رہے ہیں" علی کے چچا جان نے آتے ہوئے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے، میں اس لڑکے کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ رپورٹ تو دیکھی ہو گی تم نے، اس بار بھی فیل ہو گیا ہے۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے صاحب زادے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ اب تو ہر ہفتے پیسے لے کر جاتا ہے کہ میچ ہے" ابو نے اپنا دکھڑا سنایا۔

"سچی بات بتاؤں، اس کی عادتیں آپ لوگوں نے خود بگاڑی ہیں۔ اتنا لاڈ پیار کیا ہے آپ نے، اب بگڑے گا نہیں تو اور کیا ہو گا" چچا جان دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولے۔

"وہ تو مجھے بھی اس بات کا دکھ ہے لیکن اب تو کچھ کرو"۔

"پہلے والدین اولاد کو بے جا پیار کرتے ہیں اور جب پانی سر سے گزر جائے تو پچھتاتے ہیں۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔ چچا جان نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئے۔

"اللہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے" ابو نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے دعا دی۔

علی اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ابو ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔ خوب ناز و نعم کے ساتھ علی کی پرورش ہوئی۔ اور آج علی اس لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑا نواب زادہ بن گیا تھا۔ چچا جان اور علی کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ لیکن چچا جان کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ علی اب وہ پہلے والا علی نہیں رہا بلکہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔ وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہے تھے کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور آج وہ اسی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے علی کے پیچھے چل پڑے تھے۔ چچا جان کی گاڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی اور چچا جان کے خیالوں کی گاڑی علی کے خیالوں کے پیچھے دوڑ رہی تھی کہ اچانک انہیں علی نظر آ گیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سگرٹ کی دکان پر کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ ایک عدد سگرٹ کا پیکٹ

بھی تھا جس میں سے وہ ایک سگرٹ نکال کر جلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آخر تنگ آکر اس نے وہ سگرٹ پھینکا اور دوسرا سگرٹ جلانے ہی لگا کہ چچا جان نے زور سے ہارن دیا اور علی کو آواز دی۔ علی نے جب چچا جان کو دیکھا تو ہڑبڑا گیا اور بھاگنے لگا۔ یہ دیکھ کر چچا جان بھی علی کے پیچھے بھاگے اور جلد ہی اس کو جالیا۔ علی سگرٹ کا پیکٹ ادھر ہی چھوڑ آیا تھا۔ چچا جان نے ہنستے ہوئے پوچھا "اگر پکڑے ہی جانا تھا تو بھاگے ہی کیوں تھے؟ خواہ مخواہ مجھے بھی تھکا دیا"۔ علی نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ چلو گاڑی کے پاس چلتے ہیں"۔

لیکن علی اسی طرح کھڑا رہا۔ "کم آن بوائے" چچا جان نے کہا اور علی کو ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی کی طرف چل دیئے۔ "کب سے شروع کی؟" چچا جان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی.... وہ..... دو مہینے ہو گئے ہیں" علی نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"دو مہینے ہو گئے ہیں اور تم نے اب تک مجھے نہیں بتایا"۔

"ابو بھی تو پیتے ہیں۔ انہیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا پھر مجھ سے ہی ایسا سوال کیوں؟" جواب میں علی نے وہ بات کہی جس سے چچا جان کو ایک دم بریک لگانا پڑے۔ علی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"صرف اس لیے پیتے ہو کہ بھائی جان بھی پیتے ہیں؟ اور بچے بھی تو ہیں جن کے والد پیتے ہیں مگر وہ نہیں پیتے"۔ چچا جان کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا مگر پھر نرم پڑتے ہوئے بولے "دیکھو علی! سگرٹ ایک زہر ہے اور کون یہ بات پسند کرے گا کہ وہ زہر پیئے؟ رہی بات تمہارے ابو کی، تو بجائے اس کے کہ تم انہیں روکتے تم نے بھی وہی کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ تو ایسے شخص ہے کہ کوئی کنویں میں چھلانگ لگادے تو تم بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگادو"۔

"لیکن اس کے پینے سے سکون ملتا ہے" علی نے اطلاع پہنچائی۔

"سکون تو اللہ کی عبادت میں بھی ملتا ہے وہ کیوں نہیں کرتے۔ یہ کام کیوں شروع کیا؟ اس سے تو جسم کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ جب کہ عبادت کرنے سے کھوکھلا جسم بھی بھر جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم آئندہ سگرٹ کبھی نہیں پیو گے اور اللہ کی طرف دل لگاؤ گے۔ جب دل لگاؤ گے تو دیکھنا وہ تمہاری دعاؤں کو فٹافٹ قبول کرے گا"۔

"جی بالکل، اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میرے دل میں بے چینی کیوں رہتی ہے اور میں کمزوری کیوں محسوس کرتا ہوں" علی نے پر یقین لہجے میں کہا اور چچا جان نے مسکرا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ابو جی! یہ پیسے واپس لے لیں" علی نے سگرٹوں کے لیے بچائی ہوئی رقم ابو کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آج تو تمہارا میچ تھا۔ اس کا کیا بنا؟" ابو حیران ہوتے ہوئے بولے۔

"وہ آپ کے صاحب زادے جیت کر آئے ہیں۔ فائنل تھا، اب پیسے نہیں مانگا کریں گے" چچا جان نے علی کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیئے (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

اچھی باجی

ریحان سرور، لاہور

"رشوت، سفارش، چوری، ڈاکے، دہشت گردی، ان سب کو ختم کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ کم از کم میں تو ان کو ختم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادوں گی"۔

یہ فقرات کسی سیاست دان کے نہیں بلکہ ہماری بہن کے تھے۔ جو سیاسیات میں ایم اے کر رہی ہیں۔ ہماری یہ بہن ہر وقت اسی طرح تقریریں کرتی رہتی ہیں اور ہمیں یہ تاثر دیتی ہیں کہ ملک و قوم کا درد ان کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔ ابھی پرسوں ان کی کسی سہیلی نے فون پر بتایا کہ اس کے بھائی کو فلاں منسٹر کی سفارش سے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ باجی کو تو موقع چاہیئے تھا۔ انہوں نے اس بے چاری کو پورا ایک گھنٹا لیکچر دیا اور یہ کہتے ہوئے غصے سے فون بند کر دیا "تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر برائی کی جڑ یہی سفارش اور رشوت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ

تم نے میری سہیلی ہوتے ہوئے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے روکنے کی کوشش تک نہ کی۔ ہونہہ 'خدا حافظ"۔

"واہ! باجی واہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنی اچھی تقریر تو میں نے اپنی ساری زندگی میں نہ سنی" میں نے باجی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کیا۔

"تقریر؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ ہمارے معاشرے میں بہت سی خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو لوگوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ میری باتوں کو بھی..... ارے ٹھہرو! میری بات پوری سن لو"۔ باجی نے مجھے بھی لیکچر دینے کی کوشش کی مگر میں نے وہاں سے کھسکنے میں خیریت جانی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میری باجی بہت اصول پسند اور عظیم شخصیت ہیں مگر ذرا دوبارہ سوچئے۔ ہماری باجی اتنی عظیم بھی نہیں ہیں۔ ان کے قول و فعل میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ اس ایک واقعہ سے یقیناً آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ دو مہینے بعد باجی کے ایم اے کے امتحان شروع ہو گئے۔ باجی کے پرچے اچھے نہ ہوئے۔ لہٰذا انہوں نے ابا جان سے کسی سفارش کے لئے کہنے کا سوچا مگر ڈرتے ہوئے کہ نہ سکیں۔ آخر دو تین روز صبر کے بعد انہوں نے ابا جان سے دل کی بات کہہ ہی ڈالی کہ کسی سفارش یا رشوت کے ذریعے میرے نمبر لگوا دیں۔ یہی وہ موقع تھا جس کی تلاش ابا جان کو تھی۔ لہٰذا انہوں نے کہا "رفعت بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پرچے اچھے نہیں ہوئے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اپنے اصول اپنے ذاتی فائدے پر قربان کر دو"۔

"مگر ابو! وہ تو صرف....." باجی نے کچھ کہنا چاہا مگر ابو نے ان کی بات کاٹ دی۔

"صرف دکھاوا تھا۔ ہے نا؟ دیکھو بیٹا' اگر تم اپنی کسی بات پر قائم نہیں رہ سکتی تو اسے منہ سے مت نکالو۔ بات وہی کرو جس کو پورا کر سکو اور اس پر قائم رہ سکو۔ اگر صرف اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے ایسی باتیں کرو گی تو کسی دن بہت ذلت اٹھاؤ گی۔ اگر تم واقعی رشوت اور سفارش کا خاتمہ چاہتی ہو تو خود کام کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو پھر کم از کم دعوے اور تقریریں مت کرو"۔

"سوری ابو! واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے" باجی نے سر جھکا کر کہا۔

"شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے آئندہ اس طرح کی غلطی نہ کرو گی" ابو نے کہا۔

"جی ابو" باجی نے خوش ہو کر جواب دیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہماری باجی میں موجود قول و فعل کا یہ تضاد بالکل ختم ہو چکا ہے۔ وہ جس غلط کام سے دوسروں کو منع کرتی ہیں۔ خود بھی اس سے باز رہتی ہیں۔ اب مجھے میری باجی بہت اچھی لگتی ہیں (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

تبدیلی

محمد ہمایوں اکرم' راہ والی

"امی! میری کتاب نہیں مل رہی۔ حنا نے کمرے کی صفائی کی ہے اس سے پوچھیں"

"اوں ہوں! بیٹا' حنا آپی کہا کرو۔ تم سے دو سال بڑی ہے" امی نے کہا

"ہونہہ حنا آپی!" میں بڑبڑایا "فی الحال مجھے کتاب چاہیے میں نے کام کرنا ہے"۔

"یہ لو بھئی!" حنا آپی نے الماری میں سے کتاب نکالتے ہوئے کہا "فضول شور مچا رہے ہو"

"تم پلیز میرے کمرے کی صفائی نہ کیا کرو" میں نے پھر غصے سے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور میرے والدین مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں مگر اس کے باوجود میں بہت خود سر تھا اور ہمیشہ بڑوں' خصوصاً حنا آپی کی عزت نہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود حنا آپی مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔

"آہا! کل ماموں آ رہے ہیں؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! ابھی صبح ہی ان کا فون آیا ہے" امی بولیں۔

"پھر تو بہت مزا آئے گا' کیوں ہمایوں" آپی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"جی نہیں' مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ بہت مزا آئے گا'

ہونہہ" میں نے آپی کو حسب معمول ٹوکا۔ حنا آپی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ماموں کو آئے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ میں بے حد خوش تھا۔ وڈیو گیم کھیلنا میرا مشغلہ تھا۔ ایک دن میں وڈیو کھیل کر آیا ہی تھا کہ ماموں نے مجھے اپنے پاس بلایا "حنا نے مجھے بتایا ہے کہ تم وڈیو کھیلتے ہو؟ بیٹا' یہ تو گندے لڑکے کھیلتے ہیں۔ تم تو اچھے بچے ہو"۔ میں نے حنا آپی کی طرف دیکھا اور بولا "تم کون ہوتی ہو میری شکایت لگانے والی' اپنے آپ میں رہا کرو"۔

حنا آپی نے میری طرف اور پھر ماموں کی طرف دیکھا اور بولیں "دیکھو ہمایوں' میں نے تمہاری شکایت لگانے کی غرض سے ماموں کو نہیں بتایا بلکہ....."۔

"نہ ہی مجھے کچھ دیکھنا ہے اور نہ ہی کچھ سننا ہے" میں غصے سے بولا اور چلا گیا۔

"ماموں کیا آپ کل جا رہے ہیں" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! کل میں واپس کراچی جا رہا ہوں اور تمہاری حنا آپی بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں"۔

"بے شک لے جائیں۔ میں تو شکر ادا کروں گا اور دو مہینے خلاصی رہے گی" میں نے سوچا۔

اگلے دن ماموں کراچی روانہ ہو گئے۔ حنا باجی بھی چلی گئیں۔ ہم حنا باجی کو چھوڑ کر آئے تو گھر خالی سا لگا۔ "باجی کو واپس نہ بلا لوں"۔ میں نے سوچا "ہونہہ! سب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا" میں نے خود ہی اپنے خیال کو رد کر کے سوچا اور مطمئن ہو گیا۔

حنا باجی کو گئے دس دن گزر گئے تھے۔ اب تو گھر سے وحشت ہو رہی تھی۔ ناشتا بھی دیر سے ملتا تھا۔ کتابیں بھی اپنی جگہ پر نہیں ملتی تھیں اور کمرا بھی گندہ لگتا تھا۔ مجھے اب اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ حنا آپی کے بغیر میں اور یہ گھر دونوں مکمل نہیں ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "کیوں نہ کراچی فون کر لوں" میں نے سوچا اور نمبر ڈائل کر دیا۔ دو تین منٹوں کے بعد فون اٹھا لیا گیا۔ میں نے تعارف کرایا اور حنا آپی کو بلوایا۔ "ہیلو!" حنا آپی بولیں۔

"ہیلو!" میں خود کو سنبھال کر بولا "حنا آپی کیسی ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ! کیا سب خیریت سے ہیں؟" حنا باجی نے پوچھا۔

"جی ہاں! سب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کب آ رہی ہیں؟"

"کیوں! میری کیا ضرورت پڑ گئی" حنا باجی بولیں

"آپ پلیز جلدی سے آجائیں۔ آپ کے بغیر دل نہیں لگتا۔ میں آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ پلیز مجھے معاف کر دیں حنا باجی" میں فون پر رونے لگا۔

"ارے نہیں آپ بالکل اداس نہ ہوں! میں جلد ہی آجاؤں گی"۔ حنا باجی بولیں۔

"باجی' پلیز مجھے معاف کر دیں" میں نے پھر کہا۔

"دیکھو ہمایوں' بچے اگر غلطیاں کریں تو بڑوں کو معاف کر ہی دینا چاہیے اور اگر تم نے کوئی غلطی کی ہے تو میں نے تمہیں معاف کیا" حنا باجی ہنستے ہوئے بولیں۔

میں بھی یہ سن کر مسکرا اٹھا۔ میرے اندر بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

نیک دل جن

عاقب علی، جہلم

ہم لوگ ایک محلے میں رہتے ہیں اور محلے کے سارے لوگوں کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ ان سے اچھے مراسم بھی ہیں۔ گھروں کی دیواروں کی طرح ہمارے دل بھی آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ سب لوگ مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر لوگ غریب ہیں لیکن بہت محب وطن ہیں۔ ہمارے محلے کے بزرگ ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم سہ کر بھارت سے پاکستان پہنچے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک بزرگ بھی رہتے ہیں' جن کو سارا محلّہ سیٹھ صاحب کے نام سے جانتا ہے۔ وہ محلے کے سب سے دولت مند آدمی ہیں اور گھر میں ایک ملازم کے ساتھ رہتے ہیں۔ سیٹھ صاحب کی شہر میں بہت سی دکانیں اور مکانات ہیں جو انہوں نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ اس طرح ان کی ٹھیک ٹھاک ماہانہ آمدنی ہے۔ سیٹھ صاحب مزاج کے بہت سخت ہیں۔ بات بات پر لوگوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ وہ بھی محلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھارت

سے پاکستان آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر دس گیارہ برس تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ قافلے میں شامل تھے۔ ان دنوں سکھوں نے بہت تباہی مچا رکھی تھی۔ ایک رات سکھوں نے قافلے پر اچانک حملہ کر دیا اور قافلے کے تقریباً پچاس افراد کو شہید کر دیا۔ جس میں سیٹھ صاحب کے خاندان کے نو افراد بھی شامل تھے۔ صرف سیٹھ صاحب ہی زندہ بچ سکے۔

اس محلے میں آنے کے بعد انہوں نے بہت محنت کی اور بہت جلد بہت دولت جمع کر لی۔ لیکن انہوں نے اپنا پرانا محلّہ نہ چھوڑا' اگر وہ چاہتے تو شہر میں رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور آج تک انہیں پرانے لوگوں میں رہ رہے ہیں۔

ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ ماسی زلیخا کا بیٹا سخت بیمار تھا' اسے دس ہزار روپوں کی اشد ضرورت تھی تاکہ اپنے بچے کا آپریشن کرا سکے۔ سب سے مایوس ہو کر ماسی سیٹھ صاحب کے پاس گئی لیکن انہوں نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ محلے کے لوگوں نے انہیں بہت برا بھلا کہا۔ ماسی مایوس ہو کر گھر آ گئی۔

اگلے دن صبح سویرے ماسی زلیخا خوشی خوشی اپنے بیٹے کے آپریشن کے لیے رقم دینے جا رہی تھی اور گلی میں ہر ملنے والے کو بتا رہی تھی کہ نیک دل جن اس کے دروازے پر رقم پھینک گیا ہے۔ ہمارے محلے میں نیک دل جن کا قصہ بھی بہت پرانا ہے۔ جب بھی کسی کو کوئی اہم ضرورت ہوتی ہے' نیک دل جن اس کی ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ لیکن محلے میں کسی کو معلوم نہیں کہ یہ جن کہاں رہتا ہے؟ اور اسے آج تک کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ مگر میں اسے ہر صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ چند روز پہلے رشید مستری کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا۔ اس کی بیوی نے فریاد کی۔ محلے والوں نے اس کی اپنی بساط کے مطابق مدد کی لیکن علاج کے لیے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ سیٹھ صاحب نے بھی انکار کر دیا۔ وہ دعا کرنے لگی کہ خدا نیک دل جن کو بھیج دے۔

مجھے یقین تھا کہ اب نیک دل جن ضرور اس کی مدد کرے گا۔ لہٰذا اس رات میں نے جاگنے کا فیصلہ کیا تاکہ نیک دل جن کو دیکھ سکوں۔ رات دو بجے کا وقت تھا' ایک بزرگ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رشید مستری کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جو کہ ہمارا پڑوسی تھا۔ جب وہ ہمارے دروازے کے پاس سے گزرے تو بلب کی روشنی میں سے میں نے اس نیک دل جن کو پہچان لیا۔ وہ ہمارے محلے کے سیٹھ صاحب ہی تھے جو رشید مستری کے دروازے کے اندر ایک لفافہ پھینک کر چھپتے چھپاتے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ سیٹھ صاحب تو چلے گئے لیکن میں یہ سوچتا رہا کہ اس عظیم انسان نے نیک دل جن بن کر نہ جانے کتنے غریبوں کی بیٹیوں کو جہیز دیا' کتنے غریبوں کا علاج کروایا' کتنے یتیموں کی مدد کی لیکن اپنا نام ظاہر نہ کیا۔ اب میرے دل میں سیٹھ صاحب کی عزت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

پاکستان کو بنے ہوئے اب 51 برس ہونے کو ہیں لیکن ہمارے ملک میں سیٹھ صاحب جیسے محب وطن اور عظیم انسانوں کی کمی ہے۔ آیئے ہم سب آج مل کر یہ عہد کریں کہ ہم بھی اپنے ملک سے پیار اور محبت کریں گے اور سیٹھ صاحب کی طرح لوگوں کی بے لوث مدد کریں گے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

تھوڑا پر ستھرا

احمد عمران' لاہور

گزرے وقتوں میں ایک مزدور جس کا نام بخشو تھا کہیں سے یہ سن آیا کہ خدا تعالیٰ نے ہر ذی روح کا رزق اس کی پیدائش سے قبل ہی لکھ دیا ہے۔ وہ اس سے نہ ہی ایک لقمہ زیادہ کھانے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ ہی اسے اس سے ایک لقمہ کم ملے گا۔ بخشو بے چارہ مزدور آدمی تھا۔ سارا دن خوب محنت کرتا تھا پھر کہیں جا کر دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب رزق مقرر ہے تو پھر میں کیوں دن رات محنت کروں اور اپنی جان مصیبت میں ڈالوں۔ چناں چہ اسی خیال سے وہ اپنے گاؤں کے کنارے موجود دریا پر ایک گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے جا بیٹھا اور دل میں سوچا کہ اب مجھے روزی دینا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اور میں تو اب یہاں سے ہلنے والا نہیں۔ کچھ دیر بعد بخشو نے دریا میں ایک ہنڈیا تیرتی پائی۔ اس پر روٹیاں بھی بندھی ہوئیں تھیں۔ بخشو نے یہ دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ جلدی سے ہنڈیا پکڑی۔ جس میں سالن بھی موجود تھا۔ وہ کھانے بیٹھ گیا۔ اتنا لذیز اور بھرپور کھانا تو اس نے پہلے اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں کھایا تھا۔ بس اب روزانہ صبح

اور شام دونوں وقت یہ خدائی رزق اسے مل جاتا تھا۔

دو چار دن گزرنے کے بعد بخشو کو تجسّس ہوا کہ دیکھے کہ یہ ہنڈیا آخر آئی کہاں سے ہے۔ اسی خیال سے وہ ایک دن صبح اندازے کے ساتھ تقریباً" اسی وقت دریا کی اس سمت میں چلا جدھر سے وہ ہنڈیا آتی تھی تاکہ اس معمے کو حل کر سکے۔ چلتے چلتے وہ ایک گاؤں میں پہنچا جو غالباً" اس کے گاؤں کے ساتھ والا گاؤں تھا۔ دن نکل آیا تھا اور لوگ اپنے روزمرہ کے کاروبار میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں کی رونق دیکھنے لگا۔ پھر اسی دوران میں اس نے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے ہاتھ میں ایک ہنڈیا' جو اسی طرح کی تھی جسے وہ دریا سے پاتا تھا' اپنے ہاتھ میں لئے دریا کی طرف آ رہی تھی۔ اس عورت نے ہنڈیا کے اوپر روٹیاں باندھیں اور دریا میں رکھ کر واپس مڑنے ہی والی تھی کہ بخشو اس کے پاس پہنچ گیا۔ دیکھنے میں وہ عورت ملازمہ معلوم ہوتی تھی کیوں کہ اس کے کپڑے پرانے اور قدرے گندے تھے۔ بخشو نے پوچھا" یہ تم روزانہ ہنڈیا اور روٹیاں دریا میں کس کے لئے رکھتی ہو؟"

عورت نے اسے غور سے دیکھا اور کہا" بیٹا' ہماری مالکن کے چوٹ آگئی ہے اور حکیم نے علاج بتایا ہے کہ چالیس دن تک زخم پر صبح شام روٹیاں اور سالن لگایا جائے۔ چنانچہ میں ایسا کرنے کے بعد ان استعمال شدہ روٹیوں اور سالن کو ضائع کرنے کی بجائے دریا میں بہا دیتی ہوں کہ رزق کی بے حرمتی نہ ہو۔ پر ذرا تو یہ تو بتا کہ تو کون ہے؟ کیوں کہ میں نے تمہیں اس گاؤں میں پہلی بار دیکھا ہے"۔

"بخشو حیرت سے بولا' بلکہ اس کے منہ سے کچھ یہ الفاظ نکلے "تو کیا یہ روٹیاں اس زخم....."۔

عورت نے کہا" ہاں' پر اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

بخشو کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور اس نے چاہا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ رزق تو خدا نے دیا مگر ایسی ذلت کے ساتھ۔ چناں چہ اس نے سوچ لیا کہ وہ دوبارہ مزدوری کرے گا تاکہ چاہے تھوڑا کھائے مگر ستھرا کھائے۔ وہ اپنے ان ہی خیالوں میں لوٹ آیا اور اس عورت کی آواز کو نہ سنا جو اس سے اس کی شناخت پوچھ رہی تھی۔ (پانچواں انعام 60 روپے کی کتابیں)

گم نام محسن

عثمان مسعود' ٹھیکریاں

مارکیٹ سے واپسی پر ایک بک اسٹال کے سامنے سے گزرتے ہوئے جب ہم نے اسٹال پر نیا سال مبارک کے کارڈ دیکھے تو ہمارا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ کیوں کہ ہم پچھلے کئی دنوں سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ دراصل ہمارے دوست ہمیں ہر مرتبہ کارڈ بھیجتے تھے لیکن ہم ایسا نہیں کر پاتے تھے کیوں کہ ہم اپنا تمام جیب خرچ' خرچ چکے ہوتے تھے' اس لیے کہ ہم ذرا فضول خرچ تھے اور ہمارے والد صاحب نے بوجہ ہماری فضول خرچی ہمارا جیب خرچ بھی خاصا کم مقرر کیا ہوا تھا۔ لیکن ہم نے اس دفعہ پختہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ اپنے دوستوں کو کارڈ بھیجنے ہیں۔ اس لئے دل پر پتھر رکھ کر پچھلے تین ماہ سے جیب خرچ سنبھال رہے تھے اور اب جو کارڈ دیکھے تو ہم خوشی سے پاگل ہو گئے۔ بھاگے بھاگے گھر پہنچے۔ امی کو چیزیں دیں اور اپنے کمرے میں گئے اور الماری سے رقم نکالی جو کل 190 روپے بنی۔ ہم نے کل دس کارڈ خریدنے تھے اور خریداری کے بعد بھی خاصی رقم بچنے کی امید تھی۔ ہم گنگناتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے کہ اچانک گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکیا تھا' اس نے ایک خط تھمایا اور چلتا بنا۔ خط ہمارے نام تھا۔ ہم نے کمرے میں جا کر خط کھولا۔ خط کے الفاظ نے ہم پر سکتہ طاری کر دیا۔ لکھا تھا:

"ڈیئر شہباز' گو کہ میں تمہیں نئے سال پر کارڈ نہیں بھیج رہا پھر بھی میری طرف سے تمہیں زندگی کا ایک اور سال کم ہونے پر مبارک باد۔ ایک ایسا سال جو ہم نے بے کار گزار دیا۔ ہم نئے سال کی مبارک باد تو دیتے ہیں مگر اس آنے والے سال میں کرتے کیا ہیں؟ ذرا سوچو' ان روپوں سے جو ہم کارڈ ڈالنے میں فضول ضائع کرتے ہیں شاید کسی کے ہاں چولہا جل سکے یا شاید کسی کے گھر میں روشنی ہو سکے۔ مگر..... فقط تمہارا گمنام دوست" ہم یہ سب پڑھ کر حیران و پریشان رہ گئے اور ہم نے وہ رقم ایک ایسی جگہ بھیج دی جہاں ہمیں یقین تھا کہ وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ مگر ہم سوچتے ہیں وہ گم نام دوست کون تھا۔ بہرحال وہ ہمارا اور ہماری قوم کا محسن ہے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

کنگوتری کا شہزادہ

سلیم خاں گمی

میں جس کمپنی میں ملازم ہوں وہ درخت خرید کر کاٹتی ہے اور پھر ان کٹے ہوئے درختوں سے کھڑکیاں دروازے اور فرنیچر بنا کر بیچتی ہے۔ کمپنی کا مالک سیٹھ کمال دین ہے جو ایک سیلانی آدمی ہے اور دنیا کے کئی ملکوں کی سیر کر چکا ہے۔ اس بار وہ نیپال کی سیر کو گیا تو اسے گورکھوں کے ملک میں دریا کے کنارے ایک جنگل خریدنے کی سوجھی۔ اس جنگل کا مالک شاہی خاندان کا ایک شہزادہ تھا جس کا نام برندرا تھا۔ اس نے ڈالروں میں رقم وصول کی۔ سیٹھ کمال دین نے اپنی کمپنی کے ملازم نیپال بلوا لئے۔ ان ملازموں میں میں بھی شامل تھا۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں۔

سیٹھ کمال دین سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا "آپ نے نیپال میں جنگل خریدا، کیا پاکستان یا آزاد کشمیر میں جنگل نہیں تھے؟"

لیکن حکومت پاکستان جنگل یا جنگل کی لکڑی کا سودا نہیں کرتی اور نہ ہی سرکاری اہل کار جنگل بیچنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

"نیپال میں سرکاری طور پر جنگل بیچنے کی اجازت ہے کیا سیٹھ صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن جو جنگل میں نے خریدا ہے وہ شہزادے برندرا کی ذاتی ملکیت ہے" سیٹھ نے بتایا۔

"شہزادے کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ اپنا جنگل فروخت کرے" میں نے سوال کیا۔

"یہ سوال میں نے بھی شہزادہ برندرا سے نہایت موزوں اور مناسب طریقے سے کیا تھا" سیٹھ نے بتایا۔

"پھر کیا جواب دیا اس نے"۔

"اس نے کہا کہ جنگل میں شیر آ گئے ہیں جو عام دیہاتیوں اور لکڑہاروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ لوگ ان سے ڈرتے ہیں اور جنگل کا رخ نہیں کرتے بلکہ کچھ دیہات سے تو لوگ شیروں کے ڈر سے گھر بار چھوڑ رہے ہیں"۔

"گویا شہزادہ جنگل اس لئے کٹوانا چاہتا ہے کہ شیر نہ جنگل میں آئیں نہ نقصان کریں اور نہ ہی دیہات کے لوگ اپنے گھر خالی کریں"۔

"ہاں یہی خیال ہے اس کا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا ہے کہ میری کمپنی کو جنگل سستا مل گیا ہے" سیٹھ بولا"۔

"یقیناً فائدہ ہو گا آپ کو لیکن دیہاتی کیا کریں گے؟ نہ جنگل ہو گا نہ ان کو کام ملے گا" میں نے کہا۔

"دیہاتیوں کو کام ملے یا نہ ملے یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔ آپ اب سارے جنگل کا سروے کریں اور یہ کام دو دن میں مکمل کر کے مجھے رپورٹ دیں"۔

سیٹھ کمال دین نے مجھے حکم دیا اور شہزادہ برندرا سے ملنے کے لئے کھٹمنڈو روانہ ہو گیا، جہاں وہ رہتا تھا۔

میں نے جنگل میں گھوم پھر کر تین دن میں "جنگل

سروے" مکمل کیا۔ میرے ساتھ ایک مقامی لکڑہارا بھی تھا جو گائیڈ کا کام کرتا تھا۔ اس کی عمر 25 سال تھی جسم گٹھا ہوا تھا رنگ گورا تھا۔ چہرہ گول تھا۔ جو قدرتی تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ انسان تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے سوال کیا "جانتا ہے آپ کیوں بچا جنگل پرنس صاحب نے؟"

"نہیں پیڈرو، مجھے تو علم نہیں" میں نے کہا۔ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ جنگل میں آدم خور شیر آگئے ہیں اور لوگوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ لوگ ڈر کر گھر چھوڑ رہے ہیں۔

"آپ نہیں جانتا میں بتاتا ہوں۔ شہزادہ لوگوں کی جان بچانا چاہتا ہے شیروں سے۔ وہ جنگل کاٹ کر کھیت بنائے گا اور پھر ہم کھیتوں میں دھان بوئے گا"۔

"ہاں یہی بات ہے" میں نے کہا۔

سیٹھ نے جو جنگل خریدا تھا وہ کنگوتری کا جنگل مشہور تھا۔ کنگوتری کا گاؤں جنگل کے ایک سرے پر تھا۔ گاؤں میں ایک ہوٹل تھا جو صاف ستھرا اور مہنگا تھا۔ یہ ہوٹل سیاحوں، کوہ پیماؤں اور شکاریوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ پیڈرو نے بتایا کہ پہلے کنگوتری کے اس ہوٹل میں بہت لوگ آتے تھے۔ لیکن پچھلے دو سال سے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ چھ مہینوں کے دوران میں نہ کوئی سیاح آیا ہے، نہ کوئی کوہ پیما اور نہ ہی کوئی شکاری۔ آدم خور شیروں کے خوف سے اب کوئی بھی ادھر نہیں آتا۔ یہاں کے دیہاتی بھی گاؤں چھوڑ رہے ہیں اور رات پہرہ دیتے گزار دیتے ہیں۔

"ہماری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ رات کو جاگنا پڑتا ہے" پیڈرو نے کہا۔ ہم اس کے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ یہ گھر کیا تھا پتھروں کا بنایا ہوا ٹھکانہ تھا۔ پیڈرو، اس کی بیوی اور بچہ پہاڑی پتھروں کے بنائے ہوئے گھر میں رہتے تھے۔ آنگن میں ایک طرف چولہا تھا اور دوسری طرف کھونٹا جس سے ملگجے رنگ کی بکری بندھی تھی۔

"کیسے پتا چلتا ہے کہ شیر کدھر سے آرہا ہے؟" میں نے پیڈرو سے پوچھا۔

"شیر دن کو گاؤں پر حملہ نہیں کرتا۔ دن کو تو لکڑہاروں یا مسافروں پر حملہ کرتا ہے۔ اسے کھانے کے لئے کوئی انسان مل جائے تو وہ اور اس کا ساتھی اسے کھا کر جنگل میں سو جاتے ہیں۔ پھر رات کو آبادی کا رخ نہیں کرتے" پیڈرو نے بتایا۔

"پیڈرو! تیری بات سے پتا چلا کہ ایک تو شیر ہے اور دوسرا اس کا ساتھی"۔

ہاں، ہاں، ایک شیر اور ایک شیر کا ساتھی، وہ بھی شیر ہے" پیڈرو نے کہا "یہ شیر آدم خور ہیں صاحب جی" وہ ڈر کر بولا۔

"اگر ہر گھر کے نوجوان رات کو شیر سے بچاؤ کے لئے پہرہ دیتے ہیں تو پھر تو بھی رات بھر جاگتا ہو گا" میں نے پوچھا۔

"ہاں، رات بھر جاگتا ہوں۔ دن کو سوتا ہوں۔ کیا کروں" اس نے افسردہ ہو کر کہا۔

"تیرا ارادہ تو نہیں ہے گھر چھوڑنے کا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر شیروں کا خطرہ نہ رہے تو میں اپنے گھر میں بیوی اور بچے کے ساتھ رہوں گا۔ میرا تو سب کچھ میری بیوی بچہ اور یہ چھوٹا سا گھر ہے۔ میں بنیادی طور پر گائیڈ ہوں۔ کوہ پیما مجھے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ میں ان کی راستوں پہاڑوں اور ندی نالوں کے بارے میں راہ نمائی کرتا ہوں۔ ان کو یہاں کے لوگوں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات دیتا ہوں۔ سیاح آجائیں تو ان کو سیر کے لئے صحت افزا مقامات پر لے جاتا ہوں۔ اگر کبھی شکاری آجائیں تو ان کو شیر، چیتے، تیندوے، بھیڑیئے، ریچھ، نیل گائے، ہرن، مارخور اور گیدڑوں کے متعلق باتیں بتاتا ہوں۔ لیکن جب سے مردم خور شیروں نے اودھم مچا رکھا ہے اس طرف کوئی نہیں آیا"۔

"یہ تو بہت بری خبر ہے" میں نے کہا

"اب شہزادے نے جنگل ہی بیچ دیا ہے"

"اس سے آپ لوگوں کو مزدوری تو مل جائے گی۔ آپ لوگ درخت کاٹیں گے اور پیسے بنائیں گے" میں نے تسلی دیتے ہوئے پیڈرو سے کہا۔

"آپ جناب کی کمپنی تو بجلی سے چلنے والے آرے لے آئے گی۔ ہم لوگ تو کلہاڑوں سے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں مزدوری کہاں ملے گی" پیڈرو نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔

"فکر نہ کرو، میں تم کو مزدوری دوں گا" میں نے کہا۔

سروے کرنے کے بعد میں کنگوتری آگیا۔ جہاں میری کمپنی

کے دوسرے لوگ ہوٹل میں مقیم تھے۔ میں تین دن جنگل کا سروے کرتا رہا تھا۔ جنگل میں پانچ چھ جنگلی گاؤں تھے۔ ان دیہات کے مکین محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔ سیاح، کوہ پیما اور شکاری ان کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ اب شیروں کی وجہ سے ان لوگوں کی آمد رک گئی تھی اور دیہاتیوں کی آمدنی بھی بند ہو گئی تھی۔ ان کی اس حالت نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں رات بھر ٹھیک طرح سے سو نہ سکا۔

آدھی رات کے بعد کنگوتری کے کتے بھونکنے لگے۔ یہ سردی کا موسم تھا۔ میں جاگ اٹھا اور کمبل لپیٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ سرد دھند میں لپٹی صبح ہونے والی تھی۔ کنگوتری کا چوک خالی تھا۔ وہاں کوئی بس نہ تھی۔ کبھی اس چوک میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہو گا لیکن اب تو یہ چوک سونا تھا۔ آسمان نیلا تھا اور اس نیلے آسمان پر دور چاند چمک رہا تھا۔ یہ پچھلی رات کا چاند تھا۔ میں نے سوچا اس کی روشنی سورج نکلنے پر اپنی موت آپ مر جائے گی۔ گاؤں کی مغربی طرف دھند پہاڑیوں میں سے نکل کر پھیل رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ جادو نگری کا ماحول ہو۔ پھر اچانک میری آنکھوں نے دیکھا۔ دھند میں لپٹی ایک چٹان پر دو موٹے تازے شیر کھڑے تھے جو پوری توجہ سے گاؤں کو دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے کتے ان کو دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ دونوں شیر دور تھے۔ اگر دور نہ بھی ہوتے تو میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں ان کو دیکھتا رہا اور پھر وہ میرے دیکھتے دیکھتے واپس جنگل میں گھس گئے اور کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ میں واپس کمرے میں آ گیا۔ دوسرے دن مجھے کھٹمنڈو جانا پڑا۔ سیٹھ کمال الدین نے بلوایا تھا۔

"میں آپ کا منتظر تھا۔ ایک گڑبڑ ہو گئی ہے" سیٹھ نے کہا جو ہوٹل کے کمرے میں صوفے پر نیم دراز ہو کر لیٹا تھا۔ کیونکہ اس کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔

"کیا گڑبڑ ہو گئی سیٹھ صاحب" میں نے پوچھا۔

"ہوا یہ ہے کہ شہزادے برندرا نے کہا ہے کہ کنگوتری اور دوسرے دیہات کے مزدوروں کو کام دو"۔

"وہ تو ہم دیں گے۔ سارے مزدور پاکستان سے تو بلوائے نہیں جا سکتے"۔

"لیکن کنگوتری اور دوسرے دیہات کے سبھی لوگوں کو تو پھر بھی مزدوری نہیں مل سکتی"۔

"آپ کی یہ بات درست ہے۔ لیکن"۔

"لیکن کیا؟"

"لیکن بچے بوڑھے اور عورتیں نکال دی جائیں تو باقی لوگ کتنے بنتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو پتا نہیں۔ میں تو وہاں گیا نہیں"۔

"میں گیا ہوں۔ میں تین دن وہاں گھومتا رہا ہوں۔ صحت مند لوگ یعنی وہ لوگ جو ہماری کمپنی سے تنخواہ لے کر کام کر سکتے ہیں تھوڑے ہیں۔ میں تو کہوں گا بہت تھوڑے ہیں"۔

"تھوڑے کیسے ہیں؟" سیٹھ نے جلدی سے پوچھا۔

"لوگ پانچ چھ دیہات سے نقل مکانی کر رہے ہیں۔ اپنے گھروں کو چھوڑ کر جا رہے ہیں"۔

کیوں جا رہے ہیں وہ؟"

"اس لئے کہ جنگل میں شیر آئے ہوئے ہیں جو انسانوں کا شکار کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہوں پھر اصل بات یہ ہے کہ درختوں کی کٹائی سے پہلے ہمیں آدم خور شیروں کو ختم کرنا ہو گا"۔

"اس سلسلے میں کیا کرنا ہو گا مجھے؟"

"شکار، شیروں کا شکار۔ تم شکاری ہو۔ آپ کی یہ خوبی کس دن کام آئے گی"؟

"سیٹھ صاحب، میں تو معمولی سا شکاری ہوں، کبھی گیدڑ شکار کر لیا کبھی خرگوش۔ یہ جو شیر کا شکار ہے یہ گیدڑ یا خرگوش کا شکار نہیں ہے"۔

"مجھے پتا ہے کہ آپ شیر کا شکار بھی کر سکتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ ایک بار ارادہ کر لو تو"۔

"سیٹھ صاحب، شیر ایک نہیں، دو ہیں۔ دونوں آدم خور ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کنگوتری کے ہوٹل سے چٹان پر کھڑے دیکھا ہے ان کو"۔

"دیکھو اکبر علی، میں آپ کی خوبیاں خامیاں جانتا ہوں۔ تم آرمی میں بھی کام کر چکے ہو۔ بہادر آدمی ہو۔ دھن کے پکے ہو۔

اگر ارادہ کرلو تو شیر کو شکار کرنا آپ کے لئے بہت آسان ہے"۔

"ان دو شیروں کا شکار کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کو مارنے کی کوششیں پہلے بھی ہو چکی ہیں اور ناکام رہی ہیں۔ ایک شکاری ان شیروں کے شکار کی کوشش میں خود شکار ہو چکا ہے" میں نے کہا

"ہاں یہ درست ہے۔ شہزادہ برندرا نے مجھے بتایا تھا"۔

"اس کے باوجود آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی جان تلی پر رکھ کر آدم خور شیروں کی تلاش میں نکل جاؤں؟" میں نے سیٹھ کمال الدین سے پوچھا۔

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ شیروں کو شکار کریں۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہمارا یہ کاروباری منصوبہ ناکام ہو جائے گا اور مجھے بہت زیادہ نقصان ہو گا اتنا زیادہ نقصان کہ میری ساکھ ختم ہو جائے گی۔ اور اگر سودا سرے چڑھ گیا تو بہت منافع ہو گا اور میں آپ کو اپنی کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر بنا دوں گا"

"کیا ہم کسی شکار پارٹی کی خدمات حاصل نہیں کر سکتے؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"کوئی بھی شکار پارٹی نہیں ہے۔ فرداً فرداً جو لوگ شکار کرتے ہیں وہ بھی آدم خور شیروں کے شکار کے لئے تیار نہیں ہیں۔ جس شکاری کو شیروں نے مار ڈالا تھا وہ کوئی معمولی شکاری نہ تھا۔ بہت نامی گرامی شکاری تھا"۔

"آپ شکاری ہیں اللہ کا نام لے کر شیروں کا شکار کریں' بس" سیٹھ صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا

میرے لئے اب کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ شیروں کا شکار کروں یا شکار ہو جاؤں یا پھر سیٹھ کمال الدین کی نوکری چھوڑ کر کوئی دوسری نوکری تلاش کروں۔ سوچ سوچ کر آخر کار میں نے شکار کا چیلنج قبول کر لیا۔

سیٹھ کمال الدین نے گولیوں سمیت رائفل' ایک پستول اور دو خنجر میرے حوالے کئے۔ گائیڈ کے طور پر میں نے پیڈرو کو ساتھ لیا اور اسے ایک مہینے کی تنخواہ پیش گی دے دی۔ تنخواہ پیشگی اس لئے دی کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ شکار کون ہو گا؟ شیر یا میں؟ میں نے پیڈرو سے بکری بھی خریدی تاکہ اسے جنگل میں باندھا جائے اور شیر اس کے شکار کے لئے آئیں اور میری گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔

"شیروں کو شکار کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے" میں نے پیڈرو سے پوچھا جو کئی شکاریوں کے ساتھ گائیڈ کے طور پر کام کر چکا تھا۔

"صاحب جی' دو طرفہ کارروائی ہے۔ ہم بھی دو ہیں' شیر بھی دو ہیں"۔

"پیڈرو! سردیاں ہیں۔ ہم رات کو جنگل میں نہیں ٹھہر سکتے البتہ بکری کو مناسب جگہ پر باندھ کر خود کمبل وغیرہ اوڑھ کر چھپ سکتے ہیں"۔

"ہاں صاحب جی' اس طرح سے ہو گا۔ پانچ چھ گاؤں ہیں۔ بکری کو باری باری ہر گاؤں کے باہر باندھیں گے۔ شیر اسے کھانے آئیں گے۔ ہم گاؤں کے کسی گھر میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔ فائر کریں گے اور شیروں کو ہلاک کر دیں گے"۔

پیڈرو نے آسان نسخہ بتایا تھا لیکن دن کو تو ہمیں شیروں کی تلاش میں نکلنا تھا اور پھر شام کو کسی نہ کسی گاؤں میں بسیرا کرنا تھا۔ البتہ بکری دن کو بھی ہمارے ساتھ رہنا تھی اور رات کو بھی۔

ہمارے چار دن کنگوتری میں ضائع ہو گئے۔ دن کو کنگوتری کے ساتھ جنگل کا ٹکڑا ہم دونوں نے کھنگالا لیکن وہاں شیر تھا نہ شیر کا بچہ۔ چوتھے دن اطلاع ملی کہ گاؤں سکسہ میں شیروں نے حملہ کیا اور بچھڑا ہلاک کر کے مزے سے کھا کر چلے گئے۔ گاؤں والے کواڑ بند کیے اپنے پتھر کے گھروں میں بیٹھے کانپتے اور دعائیں مانگتے رہے۔

میں اور پیڈرو کنگوتری سے چلے اور سکسہ پہنچے۔ لوگ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے گاؤں کے چوک میں لکڑیوں کا الاؤ جلایا اور ناچتے رہے۔ وہ خوش اس لئے تھے کہ ان کے گاؤں میں شیروں کا شکار کرنے والا پاکستان سے ایک ماہر شکاری آیا ہے جسے نیپال کے بادشاہ نے بلوایا ہے۔ پیڈرو کی بکری کو چارہ دانہ خوب ملا۔

میرا سکسہ میں پورا ایک ہفتہ قیام رہا۔ میں پیڈرو اور گاؤں والوں کے ساتھ شیروں کی تلاش میں نکل جاتا اور شام کو واپس گاؤں آتا۔ منہ ہاتھ دھو کر سو جاتا۔ تین چار گھنٹے سونے کے بعد کھانا

کھا کر پھر جاگنا پڑتا کہ شاید شیر ایک بار پھر بچھڑے کی تلاش میں سکہ آجائیں۔ لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔

ایک دن اطلاع ملی کہ بھٹ نام کے گاؤں کے باہر سے ایک لکڑہارے کی کھوپڑی ملی ہے۔ اس کا سارا جسم شیر کھا چکے ہیں۔ میں اور پیڈرو بھٹ پہنچے۔ گاؤں کے چودھری سے ملے۔ وہ ہمیں لے کر اس جگہ گیا جہاں سے لکڑہارے کی کھوپڑی ملی تھی۔ شیروں کے پنجوں کے نشان بھی ملے جو انسانی خون کی وجہ سے پتھروں پر نقش ہو گئے تھے۔ لکڑہارے کو کھانے کے بعد شیر جس طرف گئے تھے اس طرف بھی نشانات تھے۔ میں نے پیڈرو سے پوچھا "کیا دیکھا تو نے؟"

"صاحب جی، لکڑہارا ایک تھا شیر دو تھے۔ دونوں نے اس کا شکار کیا"۔

"شکار کرنے کے بعد وہ کس طرف گئے؟"

صاحب جی، پتھروں پر صاف نشان نظر آتے ہیں۔ ایورسٹ چوٹی کی طرف گئے ہیں"۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔

ان کو مارنا چاہیے"۔

"اسی لئے تو ہم آئے ہیں"۔

گاؤں کے چودھری سے پوچھا گیا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے گا جنگل میں یا نہیں؟

"نہیں صاحب، میں نہیں جا سکتا، مجھے ڈر لگتا ہے"۔

چودھری یہ کہہ کر گاؤں کی طرف چل دیا اور میں اور پیڈرو جنگل میں چل کھڑے ہوئے۔ میرے پاس رائفل اور پستول کے علاوہ خنجر بھی تھا۔ پیڈرو کے پاس خشک دودھ، چائے کی پتی، کافی، کیتلی، دو پیالے اور ایک چمچہ تھا۔

ہم دوپہر کے وقت روانہ ہوئے تھے۔ سارا دن چلتے رہے۔ شام کو ایک گاؤں پہنچے جس کا نام شہزادہ کے نام پر برندرا تھا۔ اس گاؤں کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہم شیروں کے شکاری ہیں اور ان کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری اور ہماری بکری کی خوب آؤ بھگت کی۔ شام کو ہم کھانا کھا چکے تھے کہ ایک نوجوان بھاگا بھاگا آیا اور بولا۔ "میں نے دو شیر گاؤں کے جوہڑ میں پانی پیتے دیکھے ہیں"۔

میں نے رائفل سنبھالی اور نوجوان کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن جوہڑ پر کوئی شیر نہ تھا اور نہ ہی کسی شیر کے پنجوں کے نشان تھے۔ میں نے بکری جوہڑ کے کنارے باندھی اور پیڈرو اور اس نوجوان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ پہرہ دیں۔ جب شیر نظر آئے تو مجھے جگا دیں۔ میں دوسرے دن صبح تک سوتا رہا۔ نہ شیر آیا اور نہ پیڈرو نے مجھے جگایا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری ساری تکان دور ہو گئی اور میں تازہ دم ہو گیا۔

اگلے دن پھر ہمارا سفر شروع ہوا۔ بکری رات بھر سردی میں رہی تھی اس لئے اس کی حالت درست نہ تھی۔ پیڈرو کا خیال تھا کہ وہ بیمار ہو گئی ہے اور اگر آج سارا دن چلتی رہی تو پھر کبھی نہ چل سکے گی۔ پیڈرو کا بھی برا حال تھا۔ وہ پچھلے روز چھ گھنٹے چلتا رہا تھا اور رات بھر پہرہ پر رہا تھا۔ اسے چھینکیں بھی آ رہی تھیں۔

"تو اور تیری بکری اس گاؤں میں رہو۔ میں جنگل میں جاتا ہوں۔ شام کو آجاؤں گا" میں نے کہا۔

"نہیں صاحب جی۔ آپ اکیلے نہ جائیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا" وہ بولا۔

"نہیں بکری، بیمار ہے اور تیری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ اس لئے تو اور تیری بکری آرام کرو" میں نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ بھی آرام کریں آج کے دن" پیڈرو بولا۔

"میں نے ساری رات آرام کیا ہے۔ میں ٹھیک ہوں" میں نے کہا اور ہتھیار سنبھال کر چل پڑا۔ مجھے احساس تھا کہ شیر دو ہیں اور میں اکیلا ہوں۔ شیروں کو بکری کے ذریعے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر شیروں نے ایک دم حملہ کر دیا تو موت یقینی ہے۔ یہ وہ خیالات تھے جنہوں نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔

میں جنگل میں مسلسل تین گھنٹے چلتا رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ مجھے تھوڑا سستا لینا چاہیے۔ میں ایک چٹان کے چھجے کے نیچے پتھروں پر بیٹھ گیا۔ رائفل اور پستول لوڈ کئے ہوئے تھے اور میری جھولی میں تھے۔ اچانک میرے کانوں میں غراہٹ

کی آواز آئی۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا۔ رائفل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا۔ اب غراہٹ قریب سے میرے کانوں میں آئی۔

"یا خدا! یہ تو شیر کی غراہٹ ہے" میرے منہ سے نکلا۔

غراہٹ قریب تھی۔ پھر ایک نہیں دو غراہٹیں اٹھ پڑیں۔ میں نے آگے اور دائیں بائیں دیکھا۔ تینوں طرف درخت تھے اور پیچھے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ میں چٹان کی اوٹ میں بیٹھا تھا اور سر پر چٹان کا چھجا تھا!

یا خدا! یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا میرے کان بج رہے ہیں۔ پھر اچانک میں نے عجب منظر دیکھا۔ ایک شیر اور دوسری شیرنی چٹان کی اوٹ سے نکل کر خراماں خراماں جا رہے تھے۔ میں ان کو یوں جاتے ہوئے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا لیکن ان کو میرا ذرا علم نہ تھا۔ اگر انہیں علم ہوتا تو میری تکا بوٹی کر دیتے۔ ذرا دیر کے لئے تو میرے ہاتھ سن ہو گئے۔ یہ دو شیروں کی دہشت تھی۔ پھر وہ کھڑے ہو گئے اور نتھنے اٹھا کر ہوا میں سونگھنے لگے۔ جی ہاں وہ سگرٹ کا دھواں سونگھ رہے تھے۔ وہ دھواں سونگھ رہے تھے اور میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ان دونوں نے سروں کو گھمایا اور میری طرف دیکھا۔ میں تو سامنے چھجے کے نیچے پتھر پر بیٹھا تھا۔

شیر نے مجھے دیکھا اور میری طرف لپکا۔ میں نے گولی چلائی۔ نشانہ ٹھیک تھا۔ شیر کے منہ کو چیرتی ہوئی اس کے دماغ کو ناکارہ کر گئی۔ یہ دیکھ کر شیرنی لپکی اور چھلانگ لگا کر مجھ پر جھپٹی۔ لیکن اس نے زور زیادہ لگایا اور وہ چٹان کے چھجے سے ٹکرا گئی۔ یوں وہ خود ہی گر گئی۔ جب تک وہ نیچے گری میں نے پستول سے فائر کر کے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

آخری بات جو میرے لیے زیادہ خوشی کی ہے' وہ یہ ہے کہ میں اب سیٹھ کمال الدین کی کمپنی میں مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ اور یہاں کے لوگ میری اس طرح عزت کرتے ہیں جیسے میں بھی کوئی شہزادہ ہوں۔

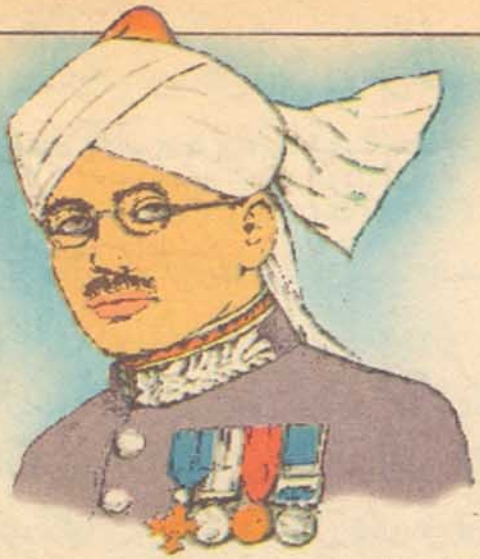

سر سکندر حیات خان

سکندر جناح پیکٹ 1936ء

قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے پنجاب کے بعض مسلمان جاگیرداروں نے بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ویسے یہ لوگ اس وقت کی یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور حکومت برطانیہ کے خیرخواہ تھے۔ پنجاب کے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات خان نے 13 اکتوبر 1936ء کو قائدِ اعظمؒ سے ملاقات کی اور مسلم لیگ میں شامل کرنے کی درخواست کی۔ قائدِ اعظمؒ نے کُل ہند مسلمانوں کے وسیع تر اتحاد کی خاطر انہیں مسلم لیگ میں شامل کرلیا۔ اگرچہ ان کی شرکت بعض مسلمان رہنماؤں کو ناگوار گذری۔

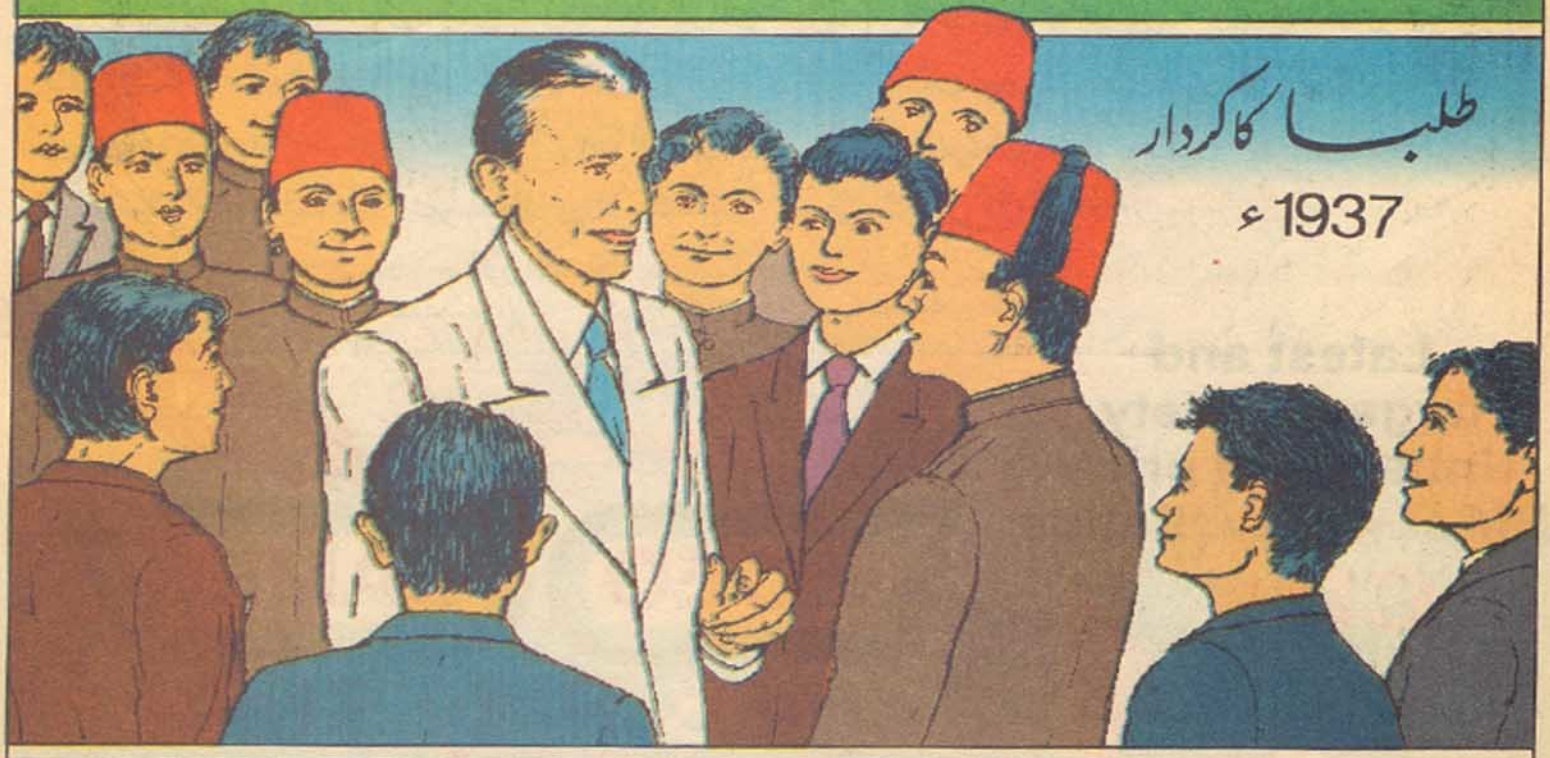

طلبا کا کردار 1937ء

مسلم طلبا نے ہمیشہ ہر مشکل مرحلے میں اپنے راہ نماؤں کا ساتھ دیا۔ تحریکِ خلافت ہو یا رولٹ ایکٹ وہ ہر طرح سے اپنے لیڈروں کے ساتھ رہے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے کی کوششوں میں ان کا کردار بنیادی رہا۔ قائدِ اعظمؒ کی آواز پر انہوں نے ہر وقت لبیک کہا اور ان کا پیغام لے کر بستی بستی اور قریہ قریہ پہنچے۔ اس سلسلے میں مسلم علی گڑھ کالج و یونی ورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور کے علاوہ سندھ، بلوچستان اور ہندوستان کی دوسری کئی درسگاہوں سے طلبا شامل ہوئے۔ 1937ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ ان کے سرگرم ارکان میں سے محمد عبدالواثق، محمد نعمان، حمید نظامی، راجا افتخار اللہ

باقی ارکان کے نام اگلے شمارے میں

یونین جیک
(برطانیہ)

قانون حکومتِ ہند 1935ء

(یہ آئینی اصلاحات کا قانون تھا)

حکومت برطانیہ نے اپنے خیال میں یہ قانون پاس کر کے ہندوستانیوں کو حکومت میں شرکت کے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کر دیئے لیکن اس قانون کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے نامنظور کیا کیونکہ ان کی نظر میں یہ قانون ہندوستانیوں کو مکمل ذمہ دار حکومت دینے کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ تھا قائد اعظمؒ نے تو یہاں تک کہ دیا کہ یہ نیا قانون ہماری مرضی کے خلاف ہم پر ٹھونسا جا رہا ہے۔

شہید گنج

1935ء
1936ء

لاہور ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ایک ہی احاطے کے اندر مسلمانوں کی ایک مسجد اور سکھوں کا ایک گوردوارہ واقع ہے سکھوں نے مسجد کے ملکیتی رقبہ پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو گیا معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ عدالت نے احاطے کا قبضہ سکھوں کو دے دیا جس کی وجہ سے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں نے کئی احتجاجی جلوس نکالے۔ مسلمانوں کے ایک جلوس کی قیادت مولانا ظفر علی خان نے کی۔ ان کے سمیت کئی دوسرے مسلمان راہ نما گرفتار بھی ہوئے۔ قائداعظمؒ لاہور آئے اور اس مقدمہ کی قانونی پیروی کی۔ ان کے تدبر سے گرفتار شدہ مسلمانوں کو رہا کر دیا گیا اور اس طرح یہ جھگڑا ختم ہو گیا۔

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 مئی 1998ء

بلا عنوان

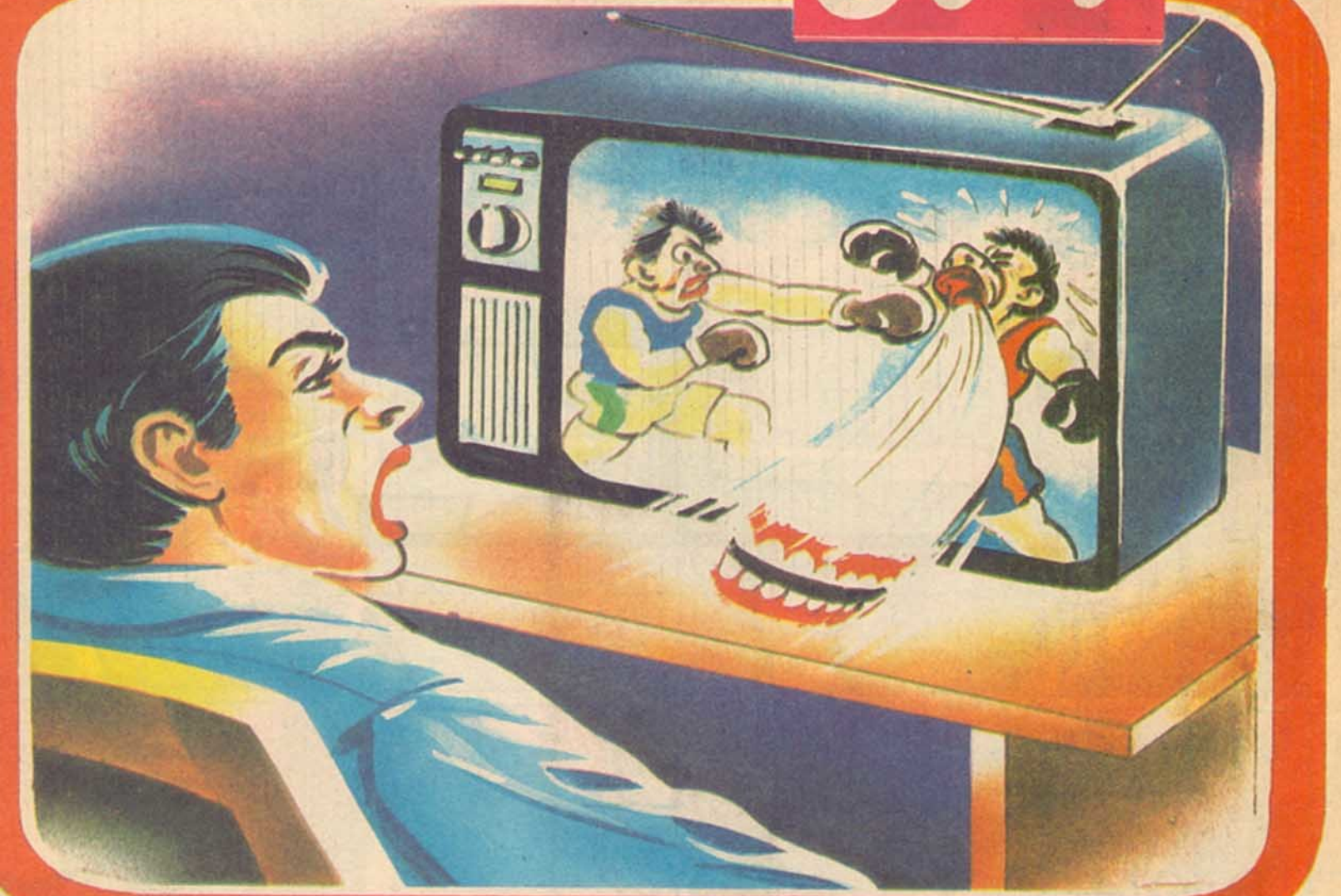

اپریل 1998ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- اسما فاروق، ساہی وال (بچت کی بچت، ورزش کی ورزش، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- سیدہ حنا رضوی، بھکر (ایسی شہرت سے بے کار بھلے، دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- احسن فضل، اقبال ٹاؤن لاہور (زور لگا کے ہیا، تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- طاہرہ عمر، گوجرانوالہ (ابا کے مزے پر منے میاں پھنسے، چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- عظیم اسلم، ساہی وال (گاڑی کھٹارہ، پکنک کباڑہ، پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- اعجاز فاطمہ، لاہور چھاؤنی (فیملی کار، چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

پیارے نبیؐ کی پیاری کہانیاں

قیمت
پچاس رو

ایوارڈ یافتہ

مصنف
ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کی نفسیات میں امتیاز کے ساتھ
ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ آپ اسلامی علوم اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ
ں کے لیے قرآن"۔ "بچوں کے لیے حدیث"۔ "جدید تعلیمی نفسیات"۔ "بچوں کی نفسیات" اور
ں کے خطرے"۔ جیسی اعلیٰ ترین کتابیں لکھ چکے ہیں۔

FEROZSONS (PVT) LTD.
LAHORE-RAWALPINDI-KARACHI

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

سوال پوچھیے

ستارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟

چاند اپنی شکل کیوں بدلتا ہے؟

نیند کیوں ضروری ہے؟

برساتی جنگلات کیا ہیں؟

کاغذ کیسے بنتا ہے؟

آئزک عاسیموف نے بچوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کے لیے یہ سب کتابیں لکھی ہیں۔ ان سب سوالوں کے جواب اِن کتابوں میں ملیں گے جنہیں جان کر آپ کو مزا آئے گا اور حیرت بھی ہوگی۔

مزید دل چسپ کتابیں دیکھنے کے لیے ہمارے شوروم میں تشریف لائیں

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی